w.urdukutabkhanapk.blogspot.c

طنز و مزاح

گفتنی شگفتنی

urdukutabkhanapk.blogspot

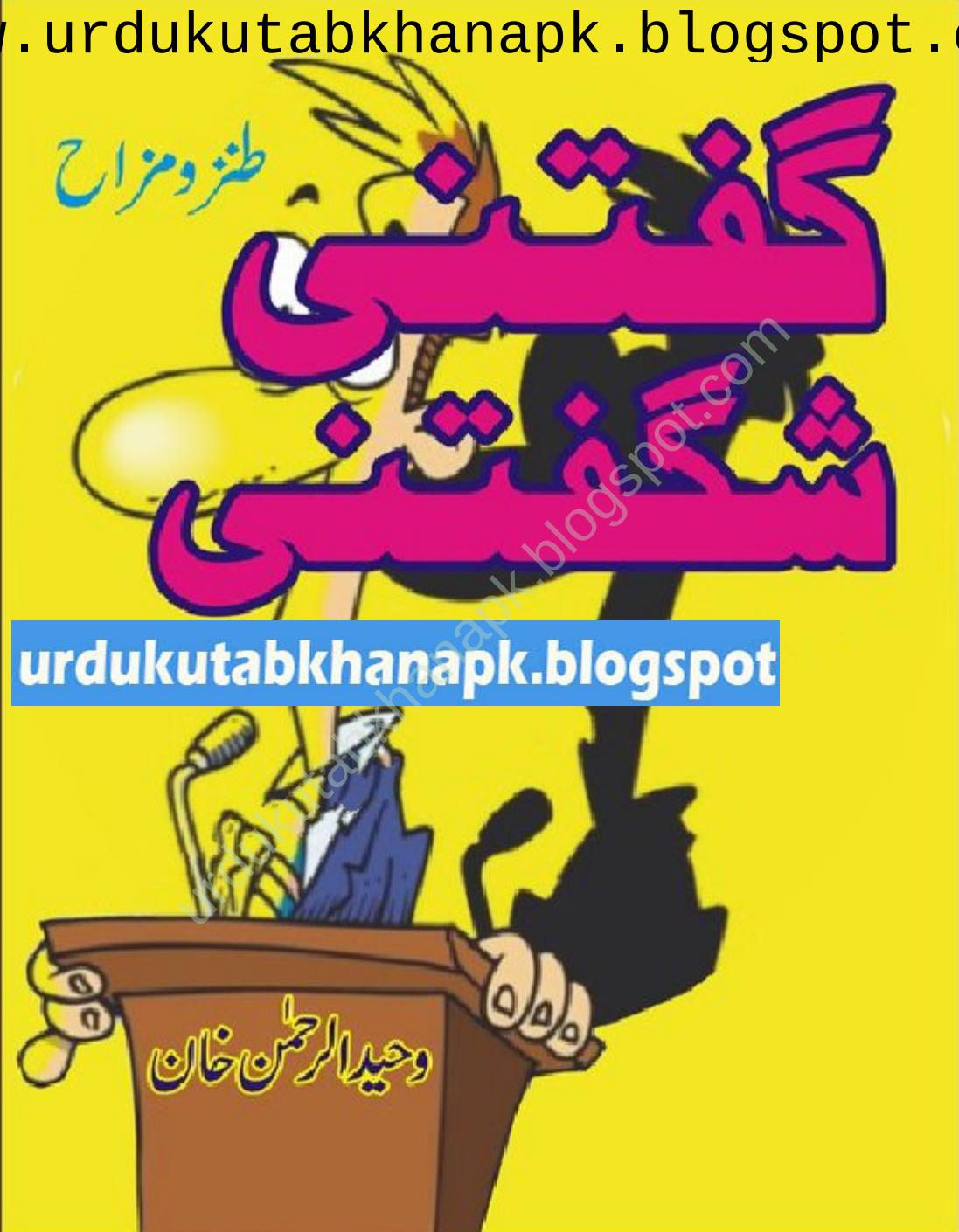

وحید الرحمٰن خان

urdukutabkhanapk.blogspot.com

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

گفتنی شگفتنی

(طنز و مزاح)

اُردو کُتب خانہ پی کے

urdukutabkhanapk.blogspot

وحید الرحمن خان

یہ عشق نہیں آساں

ہم اگرچہ دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے بھی کبھی کسی پر فریفتہ ہوئے مگر یقین کامل ہے کہ یہ ہمارا پہلا مکمل عشق ہے۔ یوں تو دل ناداں ہر حسین چہرے کو دیکھ کر دھڑکتا ہے' لیکن پچھلی رات تو ظالم نے قیامت برپا کردی۔ فقط چھتیس انچ کی چھاتی میں موصوف تقریباً نصف شب تک ہائی جمپس اور لانگ جمپس لگاتے رہے۔ سٹیمنا کی کمی کے باعث آخر تھک کر دل بیٹھ گیا' اس پر کلیجے کی صدائے دلسوز بلند ہوئی۔۔۔۔۔۔۔اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔۔۔۔۔۔۔کلیجہ تھا کہ منہ کو آتا تھا اور آنکھیں ساعت دیدار کے لئے ''چشم براہ'' تھیں۔ الغرض ہم پر سرتاپا عشق کا بھوت سوار ہوگیا۔ اس دلربا سے ہماری اولین ملاقات مرزا لعل بیگ کی بیگم بعمر 42 سال کی 24ویں سالگرہ پر ہوئی۔ نظر میں عشوہ' لبوں پر سرخی اور ہاتھ میں قورمے کی پلیٹ تھی۔ سبز پیراہن میں ملبوس وہ بہت حسین وجمیل دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی زلفیں فیشن کے مطابق چھوٹی تھیں لیکن ہماری صحت مجملہ کے پیش نظر اسیری کے لئے کافی تھیں۔ پہلی ملاقات میں ہمیں صرف شربت دیدار پر اکتفا کرنا پڑا کیونکہ وہ حسن سراپا خاصی عجلت میں تھی اور تقریب کی بھیڑ بھاڑ میں اس سے بات نہ ہوسکی۔ وہ جلد ہی ''داغ مفارقت'' دے گئی۔ بہرحال ہم نے معتبر ذرائع سے اس کے جملہ کوائف (نام' پتا' عمر' تعلیم وغیرہ) معلوم کر لئے۔ پارٹی سے واپسی پر جب گھر پہنچے تو ہم پر منکشف ہوا کہ مابدولت اردو شاعری کے روایتی عاشق کا روپ دھار چکے ہیں۔

چند دن یونہی بسر ہوگئے۔ کوچہ جاناں میں بھی کئی بار چہل قدمی کی لیکن دیدار یار سے محروم رہے۔ ملاقات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ایک دن ''چہل قدمی'' سے فراغت کے بعد گھر آئے تو اپنے کمرے میں اپنی بنت عم کو موجود پایا۔ ان کے سامنے ایک اور موصوفہ صوفہ پر براجمان تھیں۔ انہیں غور سے دیکھا تو دل ستم زدہ کو تھام تھام لیا۔ ارے یہ تو وہی دوشیزہ تھی جس کی تلاش میں ہم گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔۔۔۔۔۔۔کسی حسینہ سے اتفاقی ملاقات کو اہل دل ''حسن اتفاق'' کہتے ہیں اور یہ ہماری زندگی کا اہم ترین ''حسن اتفاق'' تھا۔ ہم جمال یار میں ایسے محو ہوئے کہ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ اچانک کزن صاحبہ کی آواز ابھری۔

''یہ ہے میری دوست۔۔۔۔۔۔۔بے مثال' اگلے ماہ اس کا امتحان ہے۔ میں اسے آپ کی شاگردی میں سونپنے آئی ہوں۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"مگر۔۔۔۔۔۔۔" ہم نے بولنا چاہا۔

"دیکھیں آپ انکار نہیں کریں گے۔"

ہم بھلا کیوں انکار کرنے لگے تھے فوراً اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ پے یہ پایا کہ بالآخر بے مثال اگلے دن سے روزانہ شام کو بذات خود ہم سے انگریزی جغرافیہ اور اردو ادب پڑھا کریں گی۔

ہم بڑی بے تابی سے اگلے روز کا انتظار کرنے لگے۔ تمام دن با آواز بلند یہ مصرع گنگناتے ہوئے گزر گیا..... لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا..... اور بے مثال آ ہی گئی۔ وہ آئی تو یوں لگا جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آئی ہو۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ دل کا ماجرا بیان کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ مگر اس نے آتے ہی انگریزی کی کتاب کھول لی اور درس دینے کا "حکم" دیا۔ درس دیتے رہے درس دیکھتے رہے۔ اور انگریزی کا سبق ختم ہو گیا۔ انگریزی کے بعد جغرافیہ کے "میدان" میں داد تدریس دی۔ اب اردو کی باری تھی۔ اس مضمون سے ہمیں چڑ تھی۔ چنانچہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن بے مثال نے موقعہ پاتے ہی ایک سوال داغ دیا۔

"آپ کے نزدیک میر بڑا شاعر ہے یا غالب؟"

جواب دیا "عمر کے لحاظ سے تو میر بڑے شاعر ہیں۔ قد میں شاید غالب میر سے بڑے ہیں۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا "میر درد اور میر انیس کی شاعری میں کیا فرق ہے؟"

"میر درد اور میر انیس کی شاعری میں انیس بیس کا فرق ہے کیونکہ دونوں ناموں میں لفظ "میر" مشترک ہے۔"

بے مثال نے اس نوعیت کے کئی سوال پوچھے جن کے آگے ہماری ہمت جواب دے گئی۔ کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو گئی اس کے چلے جانے کے بعد ہم نے خود کو دنیا کا احمق ترین آدمی قرار دیا کہ بزبان خود بھی شرح آرزو نہ کر سکے۔ خیر اظہار عشق کا پروگرام اگلے دن ملتوی کر دیا۔

اگلے روز بے مثال جلد ہی آ گئی۔ تدریس کے آغاز سے قبل اپنے پروگرام کی عملی جامہ پوشی کرنا چاہی لیکن کوئی مناسب رومانوی جملے نہ بن پڑے۔ سوچا کل ایسے موقعہ پر بولے جانے والے ڈائیلاگ یاد رکھیں گے۔ انگلش کے بعد اس نے اردو کی کتاب کھولی تو گھبرا گئے کہ شامت آ گئی۔ کیونکہ بے مثال ایک "حاضر سوال" لڑکی تھی پڑھتی کم تھی اور سوال زیادہ کرتی تھی۔ بہر حال ہم اپنے ذہن کو تیار کرنے لگے تاکہ اس کے سامنے اعلیٰ ادبی ذوق کا خاطر مظاہرہ کر سکیں۔ اس دریافت کیا۔

"آپ کا پسندیدہ شعر؟"

عرض کیا "ببر شیر"

یہ "حیوانی ظرافت" سن کر وہ کھلکھلا اٹھی۔ آنکھوں میں شرارت لئے بولی۔ "محمد حسین آزاد کون تھے؟"

محمد حسین آزاد مرد تھے ثبوت کے لئے مصرعہ ملاحظہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

اس نے مسکرا کر پھر استفسار کیا۔ "تو پھر ابوالکلام آزاد کون تھے؟"

"ابوالکلام آزاد کے ابو تھے۔" ہم نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

یہ رشتہ داری سن کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ موتی جیسے دانت چمک اٹھے۔ مسکراتے ہوئے وہ بہت ہی حسین نظر آتی۔

تعلیم و تعلم کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے آیا کرتی اور ہر روز ہی ہم حال دل بتانے سے قاصر رہتے۔ انگلش اور جغرافیہ کے مضامین میں تو ہم اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے لیکن جب وہ اردو کی کتاب کھولتی تو دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوتی۔ دراصل ہماری اردو اتنی ہی کمزور ہے جتنی کہ ہماری صحت۔ وہ بھی شاید شرارت کی غرض سے اوٹ پٹانگ استفسارات کرتی۔ ایک دن کہنے لگی۔

"امیر مینائی کے حالات زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟"

جواب میں گویا ہوئے "امیر مینائی بہت دولت مند آدمی تھے غالباً انہوں نے ایک مینا بھی پال رکھی تھی۔ ابتدا میں بہت غریب تھے اس لئے لوگ انہیں "غریب مینائی" کہہ کر پکارتے تھے۔ دن رات کی محنت سے انہوں نے دولت کمائی اور حاسدوں کو جلانے کے لئے انہوں نے اپنا نام "امیر مینائی" رکھ لیا۔"

امیر کے یہ حالات زندگی سن کر اس کے لبوں پر مسکان آ گئی۔ اف! یہ گلاب جیسے ہونٹ اور موتی جیسے دانت۔ بے مثال عجیب نظروں سے ہمیں کافی دیر تک دیکھتی رہی۔۔۔۔۔۔۔ جانے کیوں؟

بیس دن یونہی گزر گئے۔ دس دن بعد اس کے امتحان شروع ہو جائیں گے۔ پھر وہ ہم سے جدا ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر دل ڈوبنے لگا۔ کیوں نہ آج اسے صاف صاف دل کا ماجرا بیان کر دیا جائے ہم نے اٹل فیصلہ کر لیا۔ وہ جب آئی تو بے دھڑک کہہ دیا۔۔۔۔۔۔۔ "بے مثال! تم سے ایک بات کہنی ہے۔۔۔۔۔۔"

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ "قحط سالی" سے کیا مراد ہے؟"

مجبوراً جواب دینا پڑا "یہ ترکیب ایسے شادی شدہ شخص کے لئے بولتے ہیں جس کی کوئی سالی نہ ہو۔"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''اچھا! طوطا چشم کا کیا مطلب ہے؟''

''ایسا شخص جس کی آنکھیں سبز ہوں۔''

یہ سن کر وہ بے تحاشا ہنسی' اتنا ہنسی کہ دو ننھے ننھے آنسو آنکھوں سے نکل کھڑے ہوئے اور گلابی گالوں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ یہ منظر کتنا دلفریب تھا' ہمیں کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔۔۔۔۔۔۔ نہ سوال وصل' نہ عرض غم۔

کل بے مثال کا پہلا پرچہ تھا۔ آج وہ آخری بار پڑھنے آئی۔ ہم نے یہ مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ آج برملا اظہار تمنا کر دیں گے۔ وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہ تھی۔ وہی جھیل سی آنکھیں' وہی احمریں لب اور وہی سرخ و سفید رنگت۔۔۔۔۔۔۔ کچھ دیر فضا میں خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر بات شروع کرنے کی غرض سے پوچھا۔ ''آج کتابیں کیوں نہیں لائیں' کل تو تمہارا پرچہ ہے؟''

وہ لجا گئی' شرماتے ہوئے گویا ہوئی ''میں..... امتحان..... نہیں دے رہی۔''

''مگر کیوں؟'' ہم نے حیرت سے استفسار کیا۔

اس سوال پر بے مثال کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا' نظریں جھک گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''بات دراصل..... یہ ہے کہ..... اگلے ہفتے میری..... شش... شادی ہو رہی ہے۔''

یہ خبر ہم پر بجلی بن کر گری۔ تمام کائنات گھومتی نظر آئی' دل بوجھل سا ہو گیا۔

''اچھا! میں چلتی ہوں۔۔۔۔۔۔ خدا حافظ''

بے مثال نے یہ کہا اور رخصت ہو گئی۔ ہم ہونق بنے کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے۔

◆◆◆

اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

بیمار کا حال اچھا ہے

قارئین! آپ نے ''یادرفتگاں'' کے عنوان کے تحت بے شمار تعزیتی مضامین پڑھے ہوں گے۔ ایسے مضامین اکثر اس قسم کے جملوں سے شروع ہوتے ہیں۔

''مرحوم اپنی ذات میں انجمن تھے۔''

''مرحوم کی حیثیت اپنی ذات میں ایک ادارہ کی سی تھی۔''

''موصوف اپنی ذات میں ایک دبستان کا درجہ رکھتے تھے۔''

اپنے مرزا لعل بیگ نے تو حد کر دی۔ ایک تعزیت نامہ میں انہوں نے لکھا۔ ''موصوف اپنی ذات میں مقصود بالذات تھے۔''

لیکن پیارے قارئین آج ہم آپ کی ملاقات ایک ایسے شخص سے کرا رہے ہیں جو اپنی ذات میں انجمن' ادارہ یا دبستان قسم کی چیز نہیں تھا بلکہ ایک ہسپتال تھا۔ جی ہاں' ہسپتال۔ واضح رہے کہ ہم کوئی خوشامدانہ نوعیت کا تعزیتی مضمون مسلط نہیں کر رہے' آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ یہ صاحب ابھی بقید حیات ہیں۔ یہاں یہ انکشاف آپ کی حیرت دوچند کر دے گا وہ کم نصیب شخص ہم ''بذات خود'' ہیں بلکہ بقلم خود بھی ہے۔

تو صاحبو تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ ہم گزشتہ بیس برسوں سے ایک بے فکر زندگی بسر کر رہے تھے کہ اچانک ایک واقعہ نے دماغ پر عجیب و غریب اثرات مرتب کئے اور اچھی خاصی ''تذلیل نفسی'' کر کے رکھ دی۔

کاش ہم مرزا لعل بیگ سے نہ ملے ہوتے' کاش ہم نے ان سے وہ کتاب نہ مانگی ہوتی۔ اس کتاب کا عنوان ہی بہت بکواس تھا ''قاعدہ امراض''۔۔۔۔۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی عنوان ہے۔ اس کتاب کے مصنف کوئی ڈاکٹر تھے جن کا نام بہت طویل اور ثقیل تھا۔ طوالت کے خوف سے ان کا نام درج نہیں کر رہے۔ کتاب تھماتے وقت مرزا نے ڈاکٹر صاحب کے نام کے بارے میں بہت دلچسپ بات کہی۔ فرمایا' یہ اسم گرامی نہیں اسم کلوگرامی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا تصنیف کردہ قاعدہ بہت دلچسپ نوعیت کا تھا۔ غالباً

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

انہوں نے یہ ''نسخہ ہائے شفا'' ملک میں نیم حکیموں کی پرورش اور افزائش نسل کے لئے تالیف کیا تھا۔ قاعدہ میں حروف تہجی کے اعتبار سے مختلف بیماریوں کی فہرست دی گئی تھی۔ بیماریوں کے آگے ان کی علامات' پرہیز اور علاج کے طریقے بھی درج تھے۔ ہم نے درمیان سے کتاب کھولی اور یونہی ورق گردانی کرنے لگے۔ اس وقت یاد نہیں آ رہا کہ پہلی بیماری کیا تھی جس پر ہماری نظر پڑی۔ غالباً کوئی خوفناک اور موذی قسم کا مرض تھا اور ابھی کتاب کے چند صفحوں کا مطالعہ کیا تھا کہ محسوس ہوا کہ ہم پر ''بیماری اول'' نے حملہ کر دیا۔ اس انکشاف سے رگ و پے میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی' ہم نے سہم کر ورق الٹنے شروع کر دیئے۔ آگے ایک اور بیماری ''تپ دق'' پر نظر جا ٹھہری۔ اس کی متعلقہ علامات پڑھیں تو معلوم ہوا کہ یہ چنگاری بھی خاکستر وجود میں موجود ہے اور جانے کب سے ہم اس آگ میں جل رہے ہیں۔ ''سرطان'' کی تفصیلات ملاحظہ کرنے سے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمارا برج سرطان نہیں ہے۔ لیکن مطالعہ سے کھلا کہ برج جوزا کے حامل افراد کو بھی سرطان لاحق ہو سکتا ہے۔ اب معاملہ خاصا پراسرار اور دلچسپ ہو گیا تھا۔ چنانچہ کتاب کو دوبارہ ابتدا ہی سے پڑھنے کی ٹھانی اور حروف تہجی کی رو سے مطالعہ شروع کر دیا۔

سب سے پہلے ''اسہال'' سے تعارف ہوا۔ علامات کے مطابق ہم لمحہ موجود میں اسہال کی ''دست رس'' میں تھے اور فی الواقع اسی وقت ہمارے پیٹ میں ایک مروڑ اٹھا جسے ہم نے گیس کی کارستانی خیال کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا اور خود سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں ''غبار گیس'' خود اٹھتا ہے خود بر باد ہوتا ہے۔''

ابھی فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ گنبد شکم میں ایک زوردار جھکڑ چلا۔ ہم نے کتاب وہیں چھوڑ دی اور بیت الخلا کی طرف بے محابا لپکے۔ آنا جانا شروع ہو گیا۔ اگرچہ اس آمد و رفت سے کافی دیر تک کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا لیکن ہمارے تحت الشعور میں یہ بیماری پوری طرح جاگزیں ہو چکی تھیں۔ چھوٹے بھائی نے جب ہماری یہ کیفیت دیکھی تو چہک کر کہا۔

''بھائی جان! آج تو آپ بیت الخلائی مخلوق بنے ہوئے ہیں۔''

اس پھبتی سے جو سبکی ہوئی اس سے درد میں فی الفور تخفیف ہو گئی۔ ہم نے دوبارہ قاعدہ اٹھا لیا۔

''عرق النساء'' کے بارے میں ہمارا ہمیشہ سے نقطہ نظر یہ تھا کہ ''پردہ نشین'' قسم کا آزار ہے اور اس کا علاج صرف ''میٹرنٹی وارڈ'' میں ہی ممکن ہے۔ پہلے پہل تو اس سے سخت صدمہ پہنچا کہ ہمارا پیکر وجود صنفی مجبوریوں کے باعث اس روگ سے محروم ہے۔ ہمیں ہتک عزت کا احساس ہونے لگا جب اس بیماری کے کوائف دیکھے تو سکھ کا سانس لیا کہ ''عرق النساء'' کا شکار ہونے کے لئے جنس کی کوئی

قید نہیں۔ یہ جان کر ہمیں گردن اور ٹانگیں بالترتیب فخر اور درد سے اکڑ گئیں۔

اب ہماری فکر کا سرکش گھوڑا ایک اور سمت میں بگٹٹ دوڑنے لگا۔ سوچنے لگا کہ طبی نقطہ نگاہ سے ہم کتنے دلچسپ اور اہم انسان ہیں۔ میڈیکل کے طلباء ہم سے مل کر کس قدر خوش ہوں گے؟ اب انہیں ہسپتالوں کے چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں رہے گی' ہمیں پا کر ان کی تمام تعلیمی اور اکتسابی ضروریات پوری ہو جائیں گی۔ بس انہیں ہمارے گرد چند ''پھیرے'' لینا ہوں گے' اور پھر انہیں گھر بیٹھے ڈاکٹری کی ڈگری مل جائے گی۔ اس خیال نے دل میں احساس تفاخر پیدا کر دیا۔ ہم تکبر کے احساس سے سرشار کتاب کی دنیا میں ایک بار پھر کھو گئے۔ چیچک' شوگر' کالی کھانسی' ملیریا۔۔۔۔۔۔۔۔ غرض قاعدہ کا آخری صفحہ آ پہنچا۔ اس صفحہ پر ''یرقان'' کا احوال درج تھا۔ ہم طبی اعتبار سے ''یرقان'' کے معیارات پر بھی پورے اترتے تھے۔ گویا دوسرے الفاظ میں سارے جہاں کا درد بھی ہمارے جگر میں منتقل ہو چکا تھا۔

''قاعدہ امراض'' ختم ہو چکا تھا۔ ہم اپنی ''بیمار زندگی'' پر بہت شاداں و نازاں تھے۔ اسی مسرت کے عالم میں نیند آنے لگی اور ہم چارپائی پر آنکھیں بند کر کے اوندھے لیٹ گئے۔۔۔۔۔۔۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارا تمام جسم پٹیوں سے لپٹا ہوا ہے' بدن کے مختلف حصوں سے خون رس رہا ہے' اردگرد ڈاکٹروں کی ایک جماعت موجود ہے اور نرسیں قطار اندر قطار۔ طرح طرح کے اوزاروں سے آپریشن کیا جا رہا ہے اور ہم غشی کے عالم میں مسلسل چلا رہے ہیں۔ ایک چیخ تو اس قدر زور سے ماری کہ ہماری آنکھ بھی کھل گئی۔ بیدار ہوئے تو موت کا وحشت ناک خیال ستانے لگا۔ سوچنے لگے کہ ہمارا بدن تو جملہ انسانی بیماریوں کی آماجگاہ بن چکا ہے' ایسے حالات میں مزید کتنا عرصہ زندگی کا ساز بج سکے گا۔ ہم ایک اضطراری عمل کے تحت اپنا معائنہ خود کرنے بیٹھ گئے۔

ہم نے کانپتے ہوئے کلائی کی طرف دایاں ہاتھ بڑھایا اور نبض پر کچھ اس طرح مشکوک انداز میں انگوٹھا رکھا جیسے کسی جعلی اسٹامپ پیپر پر انگوٹھا ثبت کر رہے ہوں۔ نبض خاصی رفتار سے حرکت پذیر تھی۔ گھڑی نکال کر رفتار کا مشاہدہ کیا تو پتہ چلا کہ جس سبک خرامی سے لہو رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اگر اس رفتار سے ہم خود بھاگنے لگیں تو اولمپک دوڑ میں طلائی تمغہ کے حقدار ٹھہریں گے۔ خوف و تحیر کے عالم میں دایاں ہاتھ کھینچ لیا اور پسلیوں پر دستک دینے لگے۔ پسلیاں اس طریق سے کھڑکھڑائیں کہ جیسے خالی ڈھول پیٹا جا رہا ہو۔ دل کی دھک دھک اور پسلیوں کی ٹھک ٹھک کے اشتراک سے ایک نئی طرز کی آواز پیدا ہوئی جو ڈھک ڈھک سے مشابہت رکھتی تھی۔ اس دہشت انگیز صدا نے مزید ہراساں کر دیا۔ پھر ہم نے زبان باہر نکالنا چاہا اور جس قدر ایک انسان اپنی زبان دراز کر سکتا ہے اس سے ایک آدھ انچ زیادہ ہی طول دینے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد ازاں ایک آنکھ بند کر کے پیش منظر ملاحظہ کیا تو صرف نوک زباں کی جھلک دیکھ سکے' لیکن..... یہ ایک جھلک کا تماشا جگر جلا بھی گیا۔ زبان کے سرے پر زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی اب تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہم نے فوراً موٹر سائیکل باہر نکالی اور شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کے کلینک کی طرف روانہ ہو گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ڈاکٹر صاحب کلینک پر موجود تھے۔ ایک ہی سانس میں انہیں تمام روداد سنا ڈالی' وہ یہ داستان علالت سن کر ہنسنے لگے' انہوں نے مسکراتے ہوئے ہمارا بلڈ پریشر چیک کیا' پھر ٹونٹی لگا کر چھاتی اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد ایک صفحہ پر کچھ لکھا اور تہہ کر کے ہمارے حوالے کیا۔ ہم نے تہہ دل سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا' فیس پیش کی اور کلینک سے میڈیکل سٹور کی طرف چل پڑے۔ میڈیکل سٹور پر پہنچ کر نسخہ کیمسٹ کے سپرد کیا۔ اس نے نسخہ دیکھ کر ''ہنگامی'' نوعیت کا ایک بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ بعد ازاں گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اونچی آواز میں نسخہ پڑھنے لگا۔

امرت دھارا۔ دو چمچ صبح' دوپہر' شام

روزانہ صبح سویرے پانچ کلومیٹر سیر کریں۔

سونے سے قبل تیل سے سر کی مالش کریں۔

خدارا ''ذاتیات'' سے بالاتر ہو کر مطالعہ کریں۔

دکان پر ٹھہرے ہوئے تمام گاہک استہزائی انداز میں ہنسنے لگے۔ ہم نے خفیف ہو کر کیمسٹ سے کاغذ جھپٹ لیا اور وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس واقعہ کو گزرے ایک سال کا عرصہ بیت چکا ہے' اس دوران میں ہم پھر کبھی بیمار نہیں پڑے۔

◆◆◆

اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot

ہوئے ڈر کے ہم جو رسوا

ٹیپو سلطان نے مرتے دم کہا تھا ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' اس قول کی روشنی میں جب ہم اپنی حیات فانی کے متعلق سوچتے ہیں تو امید سی ہو جاتی ہے کہ اس جہان آب و گل میں ہمارا قیام کم از کم سو سال تو ہوگا۔ اور قارئین اب آپ آپ سے کیا پردہ؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اتنے بزدل واقع ہوئے ہیں کہ گزشتہ دس سالوں سے صرف اور صرف ''گیدڑ بھبکیوں کے خوف سے چڑیا گھر نہیں گئے۔ لیکن ہماری (تادم تحریر پہلی) بیگم کہ ایک سادہ لوح ''زنانی'' ہے آج تک یہ حسن ظن رکھتی ہے کہ اس کے شوہر سے بڑا تیس مار خان اس روئے ارض پر پیدا ہوا ہے اور نہ ہی مستقبل قریب میں کسی ایسے سورما شوہر کی پیدائش کے امکانات ہیں۔ بیگم کا خیال ہے کہ نرگس کے ہزاروں سال رونے سے چمن میں دیدہ ور تو پیدا ہو سکتا ہے مگر اس کے خاوند جیسے جیالے شخص کا جنم ایک ناممکن امر ہے۔ اس نیک بخت کی اس خوش گمانی کی واحد معقول وجہ افریقہ کے جنگلات میں کھیلے گئے شکار کی وہ کہانیاں ہیں جو ہم گاہے بگاہے اخبار و رسائل میں پڑھا کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنے نام سے منسوب کر کے اسے سنایا کرتے تھے۔

لیکن پچھلی رات جو حادثہ پیش آیا اس سے ہماری خانگی تعلقات پر قدرے ''گمراہ کن'' اثرات مرتب ہوئے آپ بھی وہ واقعہ سنیئے:

رات کے شاید ایک بجے تھے۔ نیند کی دیوی کی زلفیں ہمارے بازوؤں پر پریشان تھیں اور ہم ایک سہانے خواب میں کھوئے ہوئے تھے' جس کے مطابق ہمارا ایک لاکھ روپے کا انعامی بانڈ نکل آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم وہ رقم وصول کرتے بیگم کی آواز سنائی دی۔۔۔۔۔۔۔ ''منے کے ابا''

بیگم کی اس ناوقت دخل اندازی پر بے انداز طیش آیا کیونکہ نیند کا دیوی کے ساتھ ساتھ لکشمی دیوی بھی روٹھ گئیں اور یوں لاکھوں روپے کا نقصان فوری طور پر اٹھانا پڑا' خیر! بندہ کر ہی کیا سکتا تھا کھانس لینے کے سوا۔ سو ہم اکبر الہ آبادی کی روش پر عمل کرتے ہوئے کھانس دیئے اور آنکھیں ملتے ہوئے کہا ''ہوں''

وہ سرگوشی میں بولیں ''سنتے ہو؟''

''کیا ہے؟''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''گلی میں محلے کے کتے کب سے بھونک رہے ہیں' خدا خیر کرے۔''

ہم نے تقریباً اونگھتے ہوئے کہا ''بیگم! عرفی نے فرمایا تھا: آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا۔ اس لئے ان پر توجہ نہیں دینی چاہیے تم بھی آرام سے سو جاؤ۔''

''تمہیں مذاق کی سوجھی ہے اور میری جان نکلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔ آخر یہ کتے اتنے زور زور سے کیوں بھونک رہے ہیں؟''

عرض کیا ''کتے ہیں' ظاہر ہیں بھونکیں گے' اب ہنہنانے سے تو وہ رہے'' وہ خفا ہونے کے انداز میں بولیں۔

''تم سے تو بات کرنا فضول ہے' خدانخواستہ کہیں۔۔۔۔۔۔''

''زوجہ محترمہ! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ رات کو بھونکنا کتوں کے معمولات زندگی میں شامل ہے اور تم خواہ مخواہ وہم کر رہی ہو خدارا خود بھی سو جاؤ اور ہمیں بھی سونے دو۔''

ہم نے مصنوعی انداز میں بگڑتے ہوئے کہا۔ اس ہلکی سی ڈانٹ نے کام دکھایا۔ پھر بیگم کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور کچھ دیر بعد کمرے میں ان کے خراٹے بجنے لگے۔

بیگم خود تو مزے سے سو گئیں لیکن ہمیں اس مخمصے میں جاگتا چھوڑ گئیں کہ آخر یہ کتے اس قدر بلند آواز میں کیوں ''محو تکلم'' ہیں۔ اس سوال نے ہماری نیند بھی اڑا دی تھی۔ کتوں کے بھونکنے اور بیگم کے خراٹوں کے صوتی اشتراک نے ماحول کو خاصا پراسرار بنا دیا تھا۔ اسی اثنا میں برابر کے کمرے سے ''کھٹ کھٹ'' کی آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے فضا میں ایک زور دار آواز گونجی ''جاگتے رہو'' ۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت چوکیدار کا یہ نعرہ بیداری خاصا نامعقول محسوس ہوا کیونکہ ہم تو پہلے ہی جاگے ہوئے تھے اور ایک بیدار شخص کو جاگنے کی نصیحت کرنا شاہ مداروں جیسی حرکت ہے جو کسی مرحوم کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ بہرحال چوکیدار کے اس انتباہ سے اتنا ضرور ہوا کہ ہمارے کان اور بدن کے رونگٹے ہوشیار باش کی پوزیشن میں کھڑے ہو گئے اور دل کی ''دھک دھک'' میں معاً گنا اضافہ ہو گیا۔ ہم نے فوراً دل دھڑکنے کا سبب سوچا تو معلوم ہوا کہ ان دھڑکنوں کا باعث کسی کی یاد نہیں بلکہ وہ آوازیں ہیں جو ساتھ کے کمرے سے آ رہی تھیں اور چوکیدار نے تو فقط جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

یہ آواز سن کر بیگم کی آنکھ بھی کھل گئی۔ ڈر کے مارے ان کا چہرہ یوں پیلا پڑ گیا جیسے بننے کی کتاب ہو۔ ادھر ہماری حالت اپنی نصف بہتر سے کم بدتر نہ تھی۔ ہم سراپا خوف بنے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیگم کو تکنے لگے' گویا:

''اک خوف تھا کہ محو تماشائے خوف تھا۔''

لیکن ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ بیگم پر ہماری بزدلی ظاہر ہو اور بہادری کا پول کھل جائے چنانچہ تھوک نگلتے ہوئے کہا:

''لگ... لگتا ہے کہ گھر میں چور... چور آئے ہوئے ہیں۔''

''ہائے اللہ۔۔۔۔۔۔ اب کیا ہوگا؟''

''ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟'' ہم نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''گھر میں چور آئے ہوئے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

''ارے بھئی' ایسے نازک حالات میں تو ہم نے ساری حیاتی گزار دی ہے اور یاد رکھو' شکاری اگر ڈرپوک ہو تو خود ہی شکار ہو جاتا ہے۔''

''تو کیا اب آپ چوروں سے مقابلہ کریں گے؟''

بیگم سے ہمیں اتنے خطرناک سوال کی امید نہیں تھی۔ لیکن اب ہمارا سراپا کھلی میں مکمل طور پر داخل ہو چکا تھا اور فرار کی کوئی راہ باقی نہیں تھی۔ چنانچہ اپنا بھرم رکھنے کے لئے ہم نے نہایت پرجوش انداز میں کہا:

''بالکل' ساری زندگی آدم خوروں کا شکار کیا ہے' آج آدم زاد کا شکار کر کے بھی دیکھ لیتے ہیں ذرا منہ کا ذائقہ ہی بدل جائے گا۔''

بیگم تو پہلے ہی ہمارے متعلق خاصی خوش فہم واقع ہوئی تھیں۔ یہ سن کر ان کے چہرے سے خوف کے تاثرات یکایک غائب ہو گئے۔ فرط جوش سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سپاہیانہ انداز میں کہنے لگیں۔ ''آج ان چوروں کو سبق سکھا دینا۔''

یہ کہہ کر وہ بھاگتے بھاگتے کمرے کے کونے سے ڈنڈا اٹھا لائیں اور بولیں ''سرتاج! اس ڈنڈے سے ان نامرادوں کا سر کچل دینا۔''

ہم نے دل ہی دل میں فریاد کی ''اے خدا یہ کیسی بیوی ہے جو خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے سر سے تاج گرانا چاہتی ہے۔''

ہم نے کپکپاتے ہاتھوں سے ڈنڈا ہاتھ میں تھاما اور لرزتے ہوئے پوچھا ''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا۔''

''آپ باہر جا کر دشمنوں کی چٹنی بنائیں گے اور کیا کریں گے۔''

''دیکھو! تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

''مم... میں...؟'' بیگم یکدم خوفزدہ ہو گئیں۔

''ہاں ہاں بھئی شکار کے دوران پارٹنر کی ضرورت پڑتی ہے نا''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''اچھا'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ چلنے کو آمادہ ہوگئیں۔ ہم نے قدرے اطمینان محسوس کیا اور پھر گہری سوچوں میں گم ہو گئے۔

اچانک بیگم کی آواز سنائی دی۔ ''چلیں؟''

یہ سن کر ہڑبڑاتے ہوئے خیالوں کی دنیا سے واپس آ گئے اور ''میدان جنگ'' میں قدم رکھنے کے لئے آگے بڑھے لیکن اب عناصر میں وہ اعتدال کہاں تھا؟ سب قویٰ مضمحل ہو گئے اور خوف کی شدت سے چلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ سخت پریشان ہوئے کہ کہیں اصل صورت حال واضح نہ ہو جائے۔ چنانچہ اپنے بدن کی تمام قوتوں کو از سر نو مجتمع کیا اور لڑکھڑاتے ہوئے چل دیئے۔ بیگم ہمارے ساتھ ساتھ تھیں۔

صحن میں پہنچے تو وہاں ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ اور پاؤں کو پاؤں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلب روشن کرنے کے لئے ہم نے دیوار پر لگے سوئچ بورڈ کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا اور جیسے ہی بورڈ ہاتھ سے ٹکرایا' ہم نے لپک کر سوئچ آن کر دیا۔ جونہی بلب روشن ہوا' باورچی خانہ کی سمت سے ''چٹاخ'' کی زوردار آواز سنائی دی۔ شاید چوروں نے حملہ آغاز کر دیا تھا۔ اس نازک صورت حال میں ہمیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔ ہم نے فوراً شجاعت کا لبادہ اتار پھینکا اور زور زور سے شور مچانا شروع کر دیا۔۔۔۔۔۔۔ چور۔۔۔۔۔۔۔ چور۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر ڈر کے مارے ایسے دل گرفتہ ہوئے کہ چکرا کر زمین پر گر پڑے۔ زمین پر گرتے گرتے ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سیڑھیوں پر دو روشن مگر غصیلی آنکھیں ہمیں ٹکر ٹکر گھور رہی ہیں۔ پھر وہ آنکھیں غائب ہو گئیں اور ایک آواز سنائی دی۔۔۔۔۔۔ میاؤں!

کچھ دیر بعد بیگم خراماں خراماں ہمارے قریب آئیں اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر شرارت بھرے انداز میں بولیں۔۔۔۔۔۔

''سرتاج! کیسا رہا آدم زاد کا شکار''

◆◆◆

آ بیل (Bell) مجھے مار

یہ کوئی نئی بات نہیں' روز کا بلکہ شب و روز کا معمول ہے کہ ادھر میں دسترخوان میں بیٹھتا ہوں' ہاتھ کھانے کی طرف بڑھاتا ہوں کہ گھنٹی بج اٹھتی ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کبھی پہلا نوالہ منہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائے تو مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے اور مجھے کیا خود نوالہ بھی حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے جو کل میں نے چشم تصور سے درون خانہ دیکھا تھا۔ تفصیل کچھ یوں ہے کہ کل دوپہر کے کھانے کے وقت جب لقمہ اول منہ میں وارد ہوا تو ظالم نے اپنی زبان حال سے کس ترنم سے عزیز لکھنوی کا یہ مصرعہ پڑھا:

''وہ مرا پہلے پہل دخل زنداں ہونا''

اتنا باذوق نوالہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں کھایا۔ بخدا اگر شاعر عزیز زندہ ہوتے تو اپنے شعر کے اس قدر برمحل استعمال پر پھڑک اٹھتے۔

اب تک اس تحریر میں ''کھانے'' کا اتنا ذکر ہوا ہے کہ دل میں خوف پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں قارئین جلد بازی میں غلط شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرا سلسلہ نسب کسی شکم پرور قبیلے سے نہ جوڑ دیں۔ چنانچہ وضاحت کرتا چلوں کہ اپنا تو دو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری' پردادا حضور سے چچا جان تک خاندان میں جتنے بھی ''مذکر'' پیدا ہوئے کسی نہ کسی عہدے پر فوج میں نوکر رہے ہیں۔ چچا 71ء کی جنگ میں ہتھیار ڈالنے والی سپاہ کی صف دوم میں شامل تھے۔ وہ صف اول میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل نہ کر سکے کیونکہ وہاں کچھ اور صف شکن موجود تھے۔ یہاں خاندان کے بقیہ اشخاص کا فرداً فرداً تذکرہ ممکن نہیں کیونکہ یہ فہرست میری فرد حسرت سے کم طویل نہیں (فرد گناہ سے البتہ کافی طویل ہے)

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں آ پہنچی' بالکل اسی طرح جیسے شاعر نے قیامت کا ذکر چھیڑا تو بات محبوب کی جوانی تک آ پہنچی۔ ''محبوب'' سے مرزا یاد آ گئے' وہ کہا کرتے ہیں ''شریف آدمی عمر بھر بیوی کو بدرجہ محبوب سمجھتا ہے' بالکل اسی طرح جیسے غریب آدمی دال کو مرغی خیال کر کے کھاتا ہے۔'' ایک عرصہ تک ہمیں یہ منطق سمجھ نہ آئی۔ آخر ایک دن پوچھ ہی لیا:

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

''مرزا! غریب آدمی دال کو مرغی کیسے سمجھ لیتا ہے؟''

بولے ''اردو محاورے کے مطابق''

''بات کچھ پلے نہیں پڑی۔۔۔۔۔۔'' میں نے کہا

اس پر انہوں نے قلم کاغذ منگوایا اور صفحہ قرطاس پر حسابی انداز میں دال کو مرغی بنا دیا۔ مرزا نے کاغذ پر صنفی تبدیلی کا آپریشن کچھ اس انداز سے کیا:

اگر گھر کی مرغی: دال

تو دال: مرغی (گھر کی)

قارئین! آپ بھی اس ''مساوات'' کو مدنظر رکھتے ہوئے دال کھاتے وقت مرغ مسلم کے مزے لے سکتے ہیں۔ آخر غالب بھی تو زبان قلم باتیں کرتے ہوئے ہجر میں وصال کے مزے لیا کرتے تھے۔

صاحبو! ذکر ہو رہا تھا کال بیل اور کھانے کی باہمی عداوت کا۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان اس ناچیز کی جسمانی صحت کو پہنچا ہے کیونکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو۔ نتیجہ معلوم۔ نانی جان اکثر کہا کرتی ہیں ''میرے لال کے دبلا ہونے کی ذمہ دار یہ نگوڑی گھنٹی ہے' معصوم جب بھی کھانے بیٹھتا ہے یہ منحوس چنگھاڑنے لگتی ہے۔'' اس اعتبار سے میں طب کی دنیا کا واحد مریض ہوں جس کی کمزوری صحت کا سبب ایک گھنٹی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گھنٹی صرف میری صحت اور پیٹ کی دشمن نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو دن میں صرف تین بار یعنی ناشتہ' لنچ اور ڈنر کے اوقات میں میرے بے گناہ کانوں کو زحمت سماعت ہوتی۔ لیکن ادھر تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ زندگی پر نظر دوڑاتا ہوں تو گھنٹی کو اپنے دیگر معمولات میں بھی غیر معمولی طور پر مداخلت بے جا کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ کبھی بکھار تو یوں ہوتا ہے کہ میں جونہی باتھ روم میں داخل ہوتا ہوں' کال بیل بج اٹھتی ہے۔ اس عالم میں جلدی میں صابن جسم پر ملتا ہوں' جسم پر تھوڑا بہت پانی ڈالتا ہوں اور کپڑے بدل کر ''آنکھ میں پھیلتا گیا صابن'' کی اذیت بخش کیفیت میں دروازے کی طرف جاتا ہوں اور جب کنڈی کھولتا ہوں تو آواز سنائی دیتی ہے:

''اللہ کے نام پہ بابا''

اب آپ ہی بتائیے ''خدا واسطے کا بیر' اور کسے کہتے ہیں؟''

چند دن پہلے اپنے کمرے میں نہایت ہی خشوع و خضوع کے ساتھ علم طبیعیات کی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک جگہ ارشمیدس کا

ایک جملہ پڑھ کر مجھے اس سائنس دان کی سادہ دلی پر بہت پیار آیا۔ جملہ یوں تھا:

Give me a place to stand and I can lift the earth

دیکھا آپ نے' کس فخر کے ساتھ زمین اٹھانے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔

افسوس! موصوف نے کبھی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہ کی' جہاں اراکین زمین تو کیا آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن آج تک ان کی طرف سے اس قسم کا بلند بانگ دعویٰ سننے میں نہیں آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انتخابات کے دنوں میں سیاستدان عوام سے آسمان سے تارے توڑ لانے کے عہد و پیمان کر لیتے ہیں۔ لیکن ان وعدوں کی نوعیت بادہ خوار کی توبہ اور اردو شاعری کے روایتی محبوب کے وعدے کی طرح ہوتی ہے۔ اس دن جب میں طبیعات کی کتاب کے مطالعہ میں مگن تھا' اچانک آواز جرس نے تحصیل علم کے سلسلے کو منقطع کر دیا۔ ابھی کال بیل کی مکروہ صدا ''فعل جاری'' کی منزلوں سے گزر رہی تھی کہ اس میں ایک بے ہنگم چیخ بھی شامل ہو گئی اور معاملہ ''نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں'' والا ہو گیا۔ اس ''دو آتشہ صدا'' نے مجھے چونکا دیا۔ کتاب چھوڑ کر دروازہ کی طرف بھاگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے مرزا لعل بیگ زمین پر اکڑوں بیٹھے ہیں۔ ان کا رنگ بننے کی کتاب کی مانند ہو رہا تھا۔ پسینے میں شرابور تھے۔ فوراً معاملہ کی نزاکت سمجھ گیا۔ انہیں سہارا دے کر گھر لے آیا اور ابتدائی طبی امداد سے ان کی تواضع کی۔ اس ناہنجار گھنٹی نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی بے رحمانہ حرکت کی تھی لیکن مجھے تو جیسے بہانے کی تلاش تھی۔ فوراً پلاس اٹھایا اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

میں بہت خوش تھا کہ گھنٹی کا پتہ صاف ہو گیا۔ اور اب زندگانی آرام سے بسر ہو گی لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ۔۔۔۔۔۔۔ سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ گھنٹی کی وفات سے ملاقاتیوں کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اب جو ملاقاتی آتا' اس زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا کہ میرے کان تو کیا گھر کی دیواروں کے کان بھی بج اٹھتے۔ اس صورت حال میں مجھے گھنٹی کمتر برائی نظر آئی۔ چنانچہ دوسرے ہی دن نئی کال بیل خرید لایا۔ اب جبکہ کال بیل آویزاں ہو چکی ہے تو بٹن پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہتا ہوں:

آ بیل (Bell) مجھے مار

◆◆◆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ظرافت نامے

ایک تھے شاعر' فوت ہوئے تو ان کے گھر سے چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط برآمد ہوئے۔۔۔۔۔۔۔ کچھ ایسے ہی مکاتیب ہمارے ہاتھ بھی لگے۔ فرق اتنا ہے کہ ان میں ''خطوط حسن'' کے علاوہ ''مکاتیب عشق'' بھی شامل ہیں۔ افسوس ہے کہ بسیار کوشش کے صرف چند مکاتیب دستیاب ہو سکے۔ ذیل میں یہی ''ظرافت نامے'' پیش کئے جا رہے ہیں۔

بخدمت جناب سرکار حسن و شباب

جناب عالی!

مودبانہ گزارش ہے کہ فدوی کو ایک ہفتہ سے بیماری دل لاحق ہے لیکن وہ اظہار محبت سے قاصر ہے۔ براہ کرم اسے بالمشافہ ملاقات کی اجازت دی جائے تا کہ وہ حال دل بیان کر سکے اور اپنے عشق کا باقاعدہ اظہار کر سکے۔

آپ کی عین نوازش ہوگی۔

العارض

طالب علم مکتب عشق

بیمار محبت!

''درخواست'' موصول ہوئی۔ آپ کو یہ جان کر افسوس ہوگا کہ درخواست پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ مناسب یہی ہے کہ کسی اور دروازہ پر دستک دیں۔

آپ کی کل کی کارروائی بالکل ناشائستہ تھی۔ اس طرح بھرے بازار میں کسی جوان اور خوبصورت لڑکی کو محبت نامہ تھما دینا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ بہرحال پہلی غلطی سمجھ کر معاف کرتی ہوں۔

آپ مجھ سے عشق فرماتے ہیں۔ یہ پڑھ کر ہنسی آئی۔ مسٹر' عالم شباب میں یہ بیماری اکثر نوجوانوں کو ہو جاتی ہے۔ کسی اچھے سے

پاگل خانے میں علاج کرائیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ''پاگل را اشارہ کافی نیست'' مگر امید کرتی ہوں کہ آپ میرے مشورہ پر فوری عمل کریں گے۔

چھوٹے بھائی منے کو خط دے کر بھیج رہی ہوں جوابی مکتوب دینے کی کوشش قطعاً نہ کیجئے گا۔

خدا حافظ

''لڑکی''

جان من!۔۔۔۔۔۔۔ سلام محبت!

مکتوب موصول ہوا۔ خط پا کر اتنی خوشی ہوئی جیسے غیر یقینی طور پر انعامی بانڈ نکل آیا ہو۔ آپ کو میری اولین جرات عاشقانہ ناگوار گزری' اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ پہلی پہلی محبتوں میں بہت جوش و خروش ہوتا ہے' میں بھی اس سرمستی و سرجوشی کے عالم میں آپ کی خدمت میں درخواست پیش کر بیٹھا۔ کیا کرتا' دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں تو آپ کی نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر جتنی طویل زلفوں کا اسیر ہو گیا ہوں۔ آپ کی جھیل سی گہری آنکھوں میں ڈوبنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ میں ایک اچھا تیراک ہوں۔

آپ کا خیال ہے کہ کسی پاگل خانے میں علاج کراؤں کیونکہ مجھے عارضہ محبت لاحق ہے۔ عرض ہے کہ آپ میری مسیحا کیوں نہیں بنتیں؟ اس مریض عشق کو اپنی نظروں کا امرت پلا دیں کیونکہ امرت دھارا ہر مرض کی دوا ہے۔ خدارا ہمدردانہ دل سے میری عاجزانہ درخواست پر نظر ثانی کریں۔

میں ایف ایس سی میں پڑھتا ہوں۔ آپ کس جماعت میں زیر تعلیم ہیں؟ منے کو خط دینے کی بہت کوشش یک مگر وہ نہ مانا۔ دس روپے بطور رشوت دیے تب جا کر راضی ہوا۔

خدا حافظ۔۔۔۔۔۔۔ آپ کا عاشق

''لڑکا''

دیوانے صاحب!۔۔۔۔۔۔۔ سلام!

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آپ نے پھر وہی ناشائستہ حرکت دہرائی۔ میرے معصوم بھائی کو نہ صرف خط دیا بلکہ نامہ بری کے عوض رشوت بھی دی۔ دیکھئے' ہم نہ تو منے کو پولیس میں بھرتی کرانا چاہتے ہیں اور نہ ہی ڈاکیا بنانے کی خواہش مند ہیں بلکہ ہماری آرزو ہے کہ وہ ڈاکٹر بن کر اپنے بیوی بچوں کی خدمت کر سکے۔

جناب! یہ کیا عشق عشق کی رٹ لگا رکھی ہے۔ عشق میرے نزدیک دماغ کے خلل کا نام ہے اور آپ ان دنوں بد دماغی کا شاندار مظاہرہ کر رہے ہیں۔

میں ایف ایس سی کے سال دوم میں ہوں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ پری میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہیں یا پری انجینیرنگ کے۔ میں تو ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں لیکن اب میرٹ بہت ہائی (High) ہو گیا ہے۔ ابو کہتے ہیں کہ وہ نمبروں میں صرف دو سو تک کا اضافہ کرا سکتے ہیں۔ اس لئے سارا دن پڑھتی رہتی ہوں۔ البتہ رات کو کوئی نہ کوئی فلم ضرور دیکھتی ہوں۔

میرے پاس کیمسٹری کے نوٹس نہیں۔ آپ کے پاس ہوں تو منے کو دے دیں' جلد لوٹا دوں گی۔

والسلام۔۔۔۔۔۔۔"لڑکی"

جان تمنا!۔۔۔۔۔۔۔سلام شوق!

آپ کا خط پڑھ کر اس بیمار کو قرار آ گیا۔ آپ بڑی سنگدل ہیں' نہ دوا دیتی ہیں نہ دعا۔ الٹا عشق کی مخالفت میں لیکچر جھاڑ دیا۔ سنئے' عشق ایک اٹل حقیقت ہے' یہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ آپ آخر یہ بات سمجھتی کیوں نہیں؟

آپ پر سرخ رنگ بہت سجتا ہے۔ سرخ لباس میں آپ گلاب کا پھول معلوم ہوتی ہیں۔ کالج کی سفید یونیفارم میں موتیے کا پھول نظر آتی ہیں۔ جبکہ آپ کی سہیلی ہر لباس میں گوبھی کا پھول دکھائی دیتی ہے۔ موصوفہ کا وزن دس افراد کے مجموعی وزن کے برابر تو ہوگا۔ لیکن جمہوری نقطہ نظر سے اس قدر بھاری بھرکم وجود کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ جمہوری حکومت میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے۔ ویسے ان کا کل وزن کتنا ہوگا' تول کر بتائیے۔

آپ اپنے بھائی کو پولیس مین کی بجائے ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں' یہ بھی کوئی ایسا مہنگا سودا نہیں' بشرطیکہ وہ بیرون ملک سے اسپیشلائزیشن کر لے۔ اسپیشلائزیشن کا فائدہ یہ ہے کہ جب تک مریض کے تن میں جان رہتی ہے وہ ڈاکٹر کی جان نہیں چھوڑتا۔ اور جب تک مریض کی روح قفس عنصری سے پرواز کرتی ہے تو رازق دو جہاں کسی اور بیمار کا بندوبست کر دیتا ہے۔ یوں ڈاکٹر کے لئے مستقل

روزگار کے مواقع موجود رہتے ہیں۔ کاروبار چل نکلے تو کلینک میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ میرے ایک انکل ڈاکٹر ہیں۔ وہ یوں تو شعر و ادب کے لئے "غیر موصل" ہیں لیکن کلینک میں کمال ذوق سے یہ مصرعہ اکثر گنگناتے رہتے ہیں: "موت سے پہلے آدمی ہم سے نجات پائے کیوں"

آپ نے استفسار کیا ہے کہ میں کس گروپ میں زیر تعلیم ہوں۔ جان من! یوں کہنے کو تو میں پری میڈیکل میں پڑھتا ہوں۔ لیکن ہمہ وقت آپ کا کلمہ پڑھتا ہوں۔ ابا جان نصیحت کرتے ہیں کہ دل لگا کر پڑھو۔ والد صاحب کا حکم عدولی نہیں کر سکتا اس لئے آپ سے دل لگا لیا۔ اب یہ دل لگی ایک روگ بن گئی ہے۔ آپ کے غم میں اگر یہی حال رہا تو میڈیکل کالج پہنچنے سے رہا۔ اس لئے حفظ ماتقدم کے تحت ابھی سے بوٹیوں کی تیاری شروع کر دی ہے۔

بوٹی سے مجھے اپنا دوست حبیب سرخرو (رقیب روسیاہ) یاد آ گیا ہے۔ نقل لگانے میں خداداد صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس صفائی سے نقل لگاتا ہے کہ نگران دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ میٹرک کے امتحان میں تو اس نے کمال کیا۔ ایک پرچہ میں قمیض کے پلو پر آدھی کتاب لکھ کر لے گیا۔ پرچہ کے بعد کپڑے دھونے کے دوران قمیض کا دامن نچوڑتے ہوئے اس نے کیا برمحل شعر پڑھا تھا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سوچتا ہوں حبیب سرخرو جیسے ممتاز نقل نگار سے طبی مشورہ لوں۔ دعا کریں کمرہ امتحان میں نگران اعلیٰ سے علیک سلیک ہو جائے۔ آپ کے والد بہت شفیق انسان دکھائی دیتے ہیں۔ خدا انہیں جنت میں جگہ دے (آمین)

آپ نے کیمسٹری کے نوٹس مانگے ہیں۔ میں تو جان دینے کے لئے تیار ہوں' آپ نوٹس کی بات کرتی ہیں۔ البتہ اب منے کو مزید رقم نہیں دے سکتا۔ اس کے مطالبات اور اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ کیا آپ بالمشافہ ملاقات نہیں کر سکتیں؟ اس طرح میری کافی بچت ہو سکے گی اور منا بھی دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا۔

مجھے بھی فلم بینی کا چسکا ہے۔ زیادہ تر رومانوی فلمیں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ ہفتے میں ایک آدھ بار "مار دھاڑ سے بھرپور شہکار" دیکھ کر لہو گرم کر لیا کرتا ہوں۔ جس روز ہم دوست اکٹھے کوئی ایکشن فلم دیکھ لیں اس دن کالج میں سٹرائیک ضرور ہوتی ہے۔

کیا آپ کو "تم" کہہ کر پکار سکتا ہوں؟ تم خفا تو نہیں ہو جاؤ گی؟ کیا تم مجھ سے ملنا پسند کرو گی؟۔۔۔۔۔۔کب اور کہاں؟

اجازت۔۔۔۔۔۔خدا حافظ

آپ کا پریمی۔۔۔۔۔۔"لڑکا"

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

پاگل پریمی!۔۔۔۔۔۔۔سلام خلوص!

تم تو سچ مچ میرے دیوانے ہو۔باتیں بھی دلچسپ کرتے ہو۔صورت بھی زیادہ بری نہیں' تمہاری درخواست پر غور کرنا پڑے گا

امید ہے مزاج ٹھکانے ہوں گے۔

خداحافظ۔۔۔۔۔۔۔''لڑکی''

◆◆◆

خطر.....ناک جسے کہتے ہیں

ناک بیک وقت سونگھنے اور سانس لینے کے کام آتی ہے۔یار لوگ چھینکتے وقت دوسروں پر نزلہ گرانے کی خدمت بھی ناک ہی سے لیتے ہیں لیکن پھر''الحمدللہ'' کہہ کر متاثرہ شخص سے فوری برات حاصل کر لیتے ہیں اور''کلمہ رحمت'' الگ وصول پاتے ہیں۔یہ عضو چہرے کے عین وسط میں واقع ہے جس طرح دائرے کے بالکل درمیان میں مرکز ہوتا ہے۔اگر ہمارے اس دعویٰ پر یقین نہ آئے تو کسی بھی شخص کی ناک پر پرکار رکھ کر تجربہ کر لیں' بشرطیکہ وہ اپنی ناک پر نوکدار پرکار رکھنے کی اجازت دے دے۔ویسے ان دنوں کوئی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا' پرکار تو دور کی بات ہے۔پھر بھی کوئی صاحب اس ریاضیاتی وحیاتیاتی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے رضا کارانہ طور پر اپنی ناک پیش کریں تو اطمینان کر لیں کہ ان کی ناک کہیں ٹیڑھی تو نہیں' بصورت دیگر تجربہ ناکام ہو جائے گا اور ناک الگ زخمی۔

ناک کو ہاکی کے سینئر فارورڈ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کیونکہ ان میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں اپنے اپنے دائرے کے درمیان میں موجود ہوتے ہیں۔یہاں یہ بات اہم ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کے لئے جنس کی کوئی قید نہیں۔مرد وزن دونوں ہاکی کھیلتے ہیں' لیکن الگ الگ۔مل کر کھیلیں تو نقص امن کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔اسی طرح ناک پر بھی تذکیر وتانیث کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ناک عورت کی بھی ہو سکتی ہے اور مرد کی بھی۔لیکن اگر ناک عورت کی ہو تو زیادہ مناسب ہے کیونکہ جب خواتین ناک پر انگلی رکھ کر بات کرتی ہیں تو انگلی خمیدہ ہو کر بالکل ہاکی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح ناک پر دھری ہوئی انگلی یوں محسوس ہوتی ہے جیسے سینئر فارورڈ کے ہاتھ میں ہاکی۔

ستواں ناک خوبصورتی کی علامت تصور کی جاتی ہے۔بڑی بوڑھیاں آج بھی نوزائیدہ بچوں کی ناک کی کج روی درست کرنے کے لئے نہایت جوش وخروش سے ان کی ناک سے کھینچا تانی کرتی ہیں۔یہ عمل اتنی تندہی سے کیا جاتا ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ناک جڑ سے''اکھاڑی'' جا رہی ہے۔صورت حال کچھ یوں ہوتی ہے کہ دادی یا نانی اماں کی عمر کی کوئی عفیفہ انگشت شہادت اور انگشت نر کے باہمی اشتراک سے چٹکی بنائے' پنگوڑے میں آرام سے لیٹے ہوئے طفل شیر خوار کی ناک پر حملہ آور ہوتی ہیں۔بچہ رو رو کر ہلکان ہو جاتا ہے لیکن اس کا''عضو شامہ'' شکنجہ میں آ چکا ہوتا ہے' اس کی شنوائی نہیں ہوتی۔دادی یا نانی پکڑتی ہے' کھینچتی ہے' چھوڑ دیتی ہے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

(ارادے باندھتا ہوں' سوچتا ہوں' توڑ دیتا ہوں) یہ عمل بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں ناک لمبی ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ بچہ دائمی نزلہ کا شکار ہو جاتا ہے جس کی شکایت ساری زندگی رہتی ہے۔

ہمارے مرزا لعل بیگ کی ناک بھی بچپن میں ان کی نانی اماں کے ہتھے چڑھ گئی۔ نانی نے نواسہ کی ناک ستواں بنانے کے لاکھ جتن کئے لیکن سب رائیگاں گئے۔ ناک کی ''پریشانی'' تو دور نہ ہوئی البتہ نزلہ زکام کی بیماری ''گلے'' پڑ گئی۔ مرزا صاحب کے گول مٹول سراور بل کھاتی ہوئی ناک کے مجموعے کو لوٹے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ لیکن تشبیہ دینے سے قبل لوٹے کو الٹانا ضروری ہے۔ مرزا صاحب کا سر لوٹے کی طرح گول مول ہے اور ناک لوٹے کی ٹونٹی کی مانند لہراتی ہوئی۔ کمال یہ ہے کہ چہرے پر لگی ''ٹونٹی'' کا کام بھی وہی ہوتا ہے جو لوٹے کی ٹونٹی کا ہوتا ہے' یعنی (دائمی نزلہ کے طفیل) عمل بہاؤ میں معاونت۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس ناہنجار عضو کی بدولت انہیں متعدد بار ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی مرتبہ تو باقاعدہ ''تواضع'' بھی ہوئی۔ ہم نے کریدا تو گویا ہوئے:

رحمان میاں! کہاں تک سنو گے' کہاں تک سناؤں۔ آہ! جوانی کے دنوں کی بات ہے مجھے ایک کام سے دوسرے گاؤں جانا پڑا۔ راستے میں ایک پنگھٹ پر چند شوخ اور چنچل دوشیزاؤں کو پانی بھرتے دیکھا۔ ایک حسینہ دل کو بھا گئی۔ شوق کلام میں یونہی سوال کر بیٹھا۔۔۔۔۔۔ ''قاضی صاحب کا گھر کس طرف ہے؟''

''ناک کی سیدھ میں چلے جائیں' اگر آپ کی ناک سیدھی ہے تو''

اس شوخ نے ناک کو مشکوک انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔ بس اس دن سے دل ایسا میلا ہوا کہ پھر کسی کلی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔

کچھ دیر مرزا اداس بیٹھے رہے۔ چند لمحوں بعد اپنی ران پر ایک چپت ماری اور کہنے لگے:

ماسٹر مولا بخش یاد آ گئے' بڑے ظالم استاد تھے' یوں سمجھو کہ اسم بامسمی تھے۔ تعویذ گنڈا بھی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کمرہ جماعت میں اعلان فرمایا ''اگر تم میں سے کسی کے سر میں درد ہو یا کوئی اور بیماری ہو تو مجھ سے دم کرالیا کرو' ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔''

مجھے ''سرعت نزول'' کی شکایت تھی۔ میں نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا ''ماسٹر جی' میری ناک میں دم کر دیں۔''

مولا بخش صاحب اردو کے استاد تھے۔ محاورہ کا یہ استحصال برداشت نہ کر سکے۔ ڈنڈے سے اتنا پیٹا کہ نانی یاد آ گئی۔ ہاں' وہی نانی جس نے میری ناک کو ایک تجربہ گاہ بنا رکھا تھا۔ یہ سن کر ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔ ادھر مرزا صاحب اپنی دھن میں مست بیٹھے رہے

اور خاصی دیر تک یہ مصرعہ گنگناتے رہے:

''وہی ہے ناک بے ڈھنگی' جو پہلے تھی سو اب بھی ہے''

اردو زبان میں جتنے محاورے ناک سے متعلق ملتے ہیں اس قدر جسم کے کسی اور حصے کے بارے میں نہیں ہیں۔ لگتا ہے کہ اہل زبان (نااہل زبان) ناک سے ''شامہ'' کی بجائے ''محاورہ'' کا کام لیا کرتے تھے۔ ''شامہ'' انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے؟

محاوروں کی زبان میں ناک سے ایسے ایسے مشکل کام لئے جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس عضو سے چنے تک چبوائے جاتے ہیں حالانکہ ناک سے تو کوئی مشکی گھوڑا بھی چنے نہیں چبا سکتا۔ چہ جائیکہ آدم۔ اسی طرح ناک کا ٹنا بھی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں' اس کے لئے چھری کے علاوہ چیتے کا جگر بھی چاہیے۔ ''اہل ترس'' مرد تو صرف چٹیا کاٹنے پر اکتفا کرتے ہیں اور یوں ''جہان تگ ودو'' میں سرخرو ہوتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ہم نے مختلف ''ناکدار'' حضرات سے ناک کے متعلق ان کی رائے پوچھی۔ اس سروے کے دوران لوگوں کی طرف سے حیرت ناک قسم کے جوابات موصول ہوئے۔ ذیل میں اس سروے کی تفصیل پیش کی جارہی ہے:

''ناک ایک چمنی ہے۔'' ایک سگریٹ نوش نے دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ناک نہ ہو تو یہ خوش آواز خرانے کہاں سے آئیں؟'' ایک خوابیدہ قوم کے فرد نے جواب دیا۔

''ناک؟ اچھا اچھا ناک آؤٹ! مجھے تو مخالف باکسر کو ناک آؤٹ کرنے میں ہی لطف آتا ہے۔'' باکسر نے مکا لہراتے ہوئے کہا۔

''جو ناک ہی سے نہ ٹپکا تو پھر کیا ہے؟'' ایک ایسے شخص نے جواب دیا جس کی نکسیر پھوٹ رہی تھی۔

''ناک موم کی ہونی چاہیے تاکہ جدھر کی ہوا ہو اس طرف آسانی سے موڑی جاسکے۔'' سیاستدان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ناک نہ ہوتی تو میری سونے کی نتھلی بیکار جاتی۔'' امیرزادی چہکی

''ناک ایٹ دی ڈور (Knock at the Door)'' انگلش میڈیم سکول کے بچے نے ''ناک'' کو جملے میں استعمال کر دیا۔

پیارے قارئین! سروے آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب یہ بتائیں کہ ناک کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ آخر آپ بھی ''ناک والے'' ہیں۔

◆◆◆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شکم ہے کہ ستم

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارا پیٹ سینے سے دو قدم آگے تھا۔ توند اگر معمولی سی باہر نکلی ہوئی ہو تو ناظرین کی قوت بینائی اور حس مزاح کو متاثر نہیں کر سکتی۔ مگر بالشت بھر قد پہ شکم کا گز بھر ''گھیراؤ'' غضب ڈھاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم جہاں سے گزرتے مختلف القابات سے نوازے جاتے۔ کوئی ہمیں ''تپائی پہ رکھا گھڑا'' سمجھتا تو کوئی ''دھرتی پہ بوجھ'' کہتا۔ کئی ایک ہمارے ''شریر'' کو شریر قرار دیتے۔ ہم سنی ان سنی کرتے ہوئے گزر جاتے لیکن لوگ بھینس کے آگے بین بجانے سے باز نہ آتے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ آپ نے ہمارے جیسی جسمانی بناوٹ بلکہ انسانی بناوٹ نہیں دیکھی ہوگی۔ کہتے ہیں۔ ''لاعلمی نعمت ہے۔'' ایک عرصے تک اس نعمت سے مالا مال رہے۔ کبھی لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ چھاتی کی طوالت اور پیٹ کی ضخامت کو مردانہ وجاہت کا عملی نمونہ سمجھتے رہے۔ اس زعم میں ایک حسینہ کا فراداسے اظہار محبت بھی کر ڈالا اور عمر بھر اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے دست سوال دراز کر دیا۔ اس دلربا نے مسکراتے ہوئے ہوشربا آنکھوں سے ہمیں سرتاشکم دیکھا اور حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا تم دونوں مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

یہ سن کر پہلی دفعہ احساس ہوا کہ نہ صرف ہماری جسامت بلکہ عقل بھی موٹی ہے۔ بیس سال میں ایک چھوٹی سی بات نہ سمجھ سکے۔ کھرے اور کھوٹے' دبلے اور موٹے میں تمیز نہ کر سکے۔

اس سانحے کو گزرے ہفتہ ہوا۔ ندامت اور جسامت کا احساس ہر پل ستاتا رہا۔ کبھی کبھار تو بڑے خوفناک خیال آتے اور ہر دفعہ ہم اپنا شجرہ نسب لے کر بیٹھ جاتے یا ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی اجداد کی تصویروں کو بغور دیکھتے' لیکن اس سے کبھی یہ ثابت نہ ہوا کہ ہمارے آباء واجداد کا تعلق خدانخواستہ ہاتھیوں سے تھا۔ آخر ایک دن رہا نہ گیا' دوڑے دوڑے اپنے دوست شیخ صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ یہاں ایک بات گوش گزار کرتے چلیں کہ شیخ صاحب شیخی بہت بگھارتے ہیں۔ خود کو خاندانی نواب گردانتے ہیں۔ اپنی کوٹھڑی کو کوٹھی قرار دیتے ہیں اور اپنی پرانی سائیکل کو کسی گورے کی عنایت خاص بتلاتے ہیں جو ان کے دادا مرحوم کو گوری حکومت سے وفاداری کے صلے میں ملی تھی۔ چونکہ یہ ان کے دادا اور سائیکل کا نجی معاملہ ہے اس لئے ہم اس مسئلہ کے بیچ ٹانگ نہیں اڑاتے۔

ہم نے شیخ صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر نکلے' دیکھتے ہی بغلگیر ہوئے' بیٹھک میں بٹھایا۔ رسمی حال احوال کے بعد ہم

نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟''

''ہم تو مائل بہ کرم' کوئی سائل ہی نہیں'' انہوں نے کہا ''کیا چاہتے ہو؟''

''ہم اس توند کے ہاتھوں بہت تنگ ہیں۔ بہت کوشش کرتے ہیں کہ کم کھائیں مگر یہ پاپی پیٹ بھرتا ہی نہیں۔ بخدا' کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قدرت نے پیٹ کی جگہ عمرو عیار کی زنبیل فٹ کر دی ہے۔ اب آپ ہی کوئی دوا' کوئی علاج بتائیے۔'' وہ گویا ہوئے

''کھانے پینے سے جسم فربہ نہیں ہوتا' اگر یہ بات ہوتی تو ہم تم سے دگنے ہوتے۔ ابھی تمہارے آنے سے پہلے دس چانپیں کھا کر بیٹھا ہوں مگر مجال ہے جو کبھی جسم پر فالتو چربی چڑھی ہو۔''

''مگر آج تو منگل ہے' گوشت کا ناغہ ہے۔'' ہم نے ٹوکا

''بھئی! میں مرغ چانپ کی بات کر رہا ہوں۔'' انہوں نے فوراً پینترا بدلا

''تو میں کہہ رہا تھا کہ تناول کی زیادتی سے انسان موٹا نہیں ہوتا بلکہ ورزش نہ کرنے کے سبب جسم کو فالتو بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آج سے ورزش شروع کر دو' تم بھی ہمارے طرح سمارٹ ہو جاؤ گے اور کئی دلوں کی دھڑکن بن جاؤ گے۔''

''واقعی؟'' ہم نے بے یقینی سے پوچھا

''آزما کر دیکھ لو'' انہوں نے دعوت عمل دی۔

ہم نے وہیں ان کا ''نقد'' شکریہ ادا کیا۔ اور خوشی خوشی رخصت ہوئے۔ دبلا ہونے کا یہ نسخہ سن کر ایسے خوش تھے گویا قارون کا خزانہ پالیا ہو۔ اس لمحے چشم تصور میں ایک رومان پرور نظارہ گھوم گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی کافر جس نے ہمارے ننھے منے دل کو بے دردی سے قدموں تلے روندا تھا' ایک حسین وادی میں موجود ہے۔ اور ہم دلبر کے پہلو میں بے تکلف بیٹھے اسی کی زلفوں سے کھیل رہے ہیں۔ اس تصویر خیال میں ہم کافی سمارٹ نظر آ رہے ہیں اور وہ مہ جبیں ہماری اچانک ''کوتاہ شکمی'' پر حیرت زدہ تھی۔ پھر وہ یکا یک ہمارے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیم کلاسیکل انداز میں گنگنا اٹھتی ہے:

تماشائے اہل شکم دیکھتے ہیں
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

شعر سنتے ہی خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ہمارے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی پھیل جاتی ہے۔ بہرکیف ہم نے ایک کتاب گھر سے ''ورزش'' کے متعلق ایک مفید کتاب خریدی۔ کتاب کے مطابق صبح کا وقت ورزش کے لئے موزوں تھا۔ ادھر ہم دن چڑھے لمبی تان کر سونے والوں میں سے تھے چنانچہ صبح سویرے جاگنے کے لئے الارم لگایا اور رات کو بے دھڑک سو گئے۔

ابھی ہماری آنکھ لگی ہی تھی کہ کمرے میں کہرام مچ گیا۔ یوں لگا جیسے جنگ کا نقارہ بج رہا ہو۔ شور سن کر ہم تو کیا ہمسائے کا مرغا بھی جاگ اٹھا اور بانگ پر بانگ دینے لگا۔ ہم بجلی کی سی تیزی سے اٹھے' بستر سے کودے' منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور ورزش کے لئے تیار ہو گئے' جو گنگ کی غرض سے سبزہ زار کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ راستے میں کئی کتے ہم پر غرائے' کچھ باقاعدہ بھونکے لیکن ہم اپنی دھن میں دوڑتے رہے' کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ''بھونکنے والے کتے کاٹا نہیں کرتے'' مگر شاید کتے یہ بات نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ بیک وقت کئی کتوں نے ہمارا باقاعدہ تعاقب شروع کر دیا۔ یہ لشکر سگاں دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے۔ حفظ ماتقدم کے تحت اپنی رفتار میں اضافہ کیا۔ نتیجتہ کتے

پیچھے رہ گئے اور ہم اس دوڑ میں اول قرار پائے۔ اپنی سبک خرامی اور کتوں کی کم کوشی پر خدا کا شکر بجالائے۔

میدان میں داخل ہوئے تو ہماری حالت دیدنی تھی۔ سانس یوں چل رہی تھی جیسے دھونکنی پھونکی جا رہی ہو۔ سانس کی آمد و رفت سے بحیرہ روم پر مدوجزر کی موجیں رقصاں تھیں۔ سینے میں دل کنویں کے مینڈک کی طرح اچھل رہا تھا۔ کچھ دیر تو ہمیں ہوش بھی نہ رہا۔ ذرا سنبھلے تو ورزش کی ٹھانی۔ پہلے پہل کمر کی ورزش کیلئے کمر ہمت باندھی۔ کیونکہ ہمارے نزدیک کمر وہ مقام ہے جو پیٹ اور سینے کی حدود کا تعین کرتا ہے اور دبلا ہونے کے لئے کمر کا ''محبوب کی کمر'' کی طرح باریک ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ پیٹ کے آس پاس کمر ٹٹولنے لگے مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ شکم اور سینے کے درمیان ایسی کوئی حد بندی نظر نہ آئی۔ اتنا ہم جانتے تھے کہ کمر پسلیوں سے ذرا نیچے واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ پسلیوں سے زیریں علاقہ کو کمر مانتے ہوئے ہاتھ دھر دیا اور اچھل کود شروع کر دی۔ اس قدر وزنی توند کے ساتھ ہماری یوں اچھل کود سے ''رن'' ایک طرف ''چرخ کہن'' بھی کانپ اٹھا۔ کافی دیر بعد ہمیں اپنی زیادتی کا احساس ہوا چنانچہ کمر سے ''ہاتھ اٹھالئے'' اور کتاب میں موجود ورزشوں کی تراکیب کے بارے میں سوچنے لگے۔ یاد آیا کہ ڈنڈ پیلنے سے بہتر کوئی ورزش نہیں۔ چنانچہ ڈنڈ پیلنے کے لئے جھکے۔ ہم جھک تو با آسانی گئے مگر اٹھنا جہان سے اٹھنے کے مانند محسوس ہوا۔ لیکن صاحبو! ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا۔ ذاتی ہمت و کوشش سے پانچ سات بیٹھکیں لگا ہی لیں۔ یوں ہم اپنے پہلے دن کی کارکردگی سے بہت

خوش تھے۔

غرض صبح سویرے ورزش ہمارا معمول بن گیا۔ کوئی ایک ہفتہ بعد خیال آیا کہ کیوں نہ اپنا وزن کرایا جائے تاکہ پتہ چل سکے کہ وزن میں کتنی کمی واقعی ہوئی ہے۔ اب جو وزن مشین پر کھڑے ہوئے تو دل بیٹھ گیا۔ مشین کی سوئی تیزی سے گھومی اور وہاں جا کر رک گئی جہاں ایک ہفتہ قبل تھی۔ وزن نہ تولہ کم ہوا نہ ماشہ زیادہ۔ گویا اتنی کاوشوں اور محنتوں کے باوجود توند کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہا۔ لیکن صبر کیا اور منہ لٹکائے گھر کا رخ کیا۔ ہم بوجھل قدموں سے چلے آ رہے تھے۔ کہ راستے میں مرزا لعل بیگ سے ملاقات ہو گئی تشویش ناک لہجے میں پوچھنے لگے:

''کن سوچوں میں گم ہو میاں!''

ہم نے جھٹ ساری رام کہانی سنا دی۔ بولے:

''تم تو یونہی توند کی فکر میں دبلے ہو رہے ہو' میں تمہیں دبلا ہونے کا تیر بہدف نسخہ بتاتا ہوں۔ اگر ایک ہفتے میں تمہارا وزن نصف نہ ہو جائے تو جو چور کی سزا' وہ میری''

ہم نے تڑپ کر استفسار کیا ''مرزا! کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساؤ گے''

گویا ہوئے ۔۔۔۔۔۔ ''دیکھو جی! اگر وزن کم کرنا ہے تو خوراک کم کر دو۔ ورزش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ڈائٹنگ نہ کی تو تا حشر یونہی موٹے رہو گے۔''

ان سے دبلا ہونے کا جدید نسخہ سن کر پھولے نہ سمائے' سوچا کل سے ڈائٹنگ کیا کریں گے ۔۔۔۔۔۔ اگلی صبح نہا دھو کر تیار ہوئے اور دسترخوان کے گرد سج کر بیٹھ گئے۔ ابھی منہ میں پہلا لقمہ ہی ڈالا تھا کہ یاد آیا کہ آج سے تو ڈائٹنگ کا آغاز کرنا ہے۔ ناشتہ کا سامان دیکھ کر جی للچایا لیکن ہم نے فارسی مثل کے مطابق بلی کو پہلے دن ہی مارنے کا فیصلہ کیا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تمام گھر والے حیرت زدہ رہ گئے اور کھانے سے اجتناب کی وجہ کے بارے میں کریدنے لگے۔ ہم نے حقیقت حال بیان کی تو بجائے اس کے حوصلہ افزائی کرتے' سب کے سب افراد طنزیہ انداز میں کھلکھلا اٹھے۔ بھائی جان نے تو ہنستے ہوئے یہ تک کہہ دیا:

''ابھی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی کہ تم دبلے ہو جاؤ''

یہ کڑوی بات سن کر بھی دل برداشتہ نہ ہوئے۔ بلکہ ایک نیا عزم اور حوصلہ لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور خالی پیٹ کالج روانہ ہو گئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کالج میں پاپی شکم نے بڑے تقاضے کئے ادھر ہم پیریڈ پڑھ رہے تھے ادھر آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی تھیں۔ لیکن پیٹ اور دل پر جبر کیا اور کینٹین کا رخ نہ کیا۔ کالج سے واپس ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا مگر ہم نے کچھ نہ کھایا۔ حالانکہ بھوک سے برا حال تھا۔ سوچا دو چار دن کی فاقہ کشی سے وزن کم ہو جائے گا اور یوں ہم گھر والوں کو دبلا ہو کر دکھا دیں گے۔

شام ہوئی تو بھوک اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یوں لگا جیسے پیٹ میں چوہے نہیں ہاتھی دوڑ رہے ہیں۔ لیکن صبر کیا۔ رات ہوئی تو سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ لیکن ہمیں بھوک کے مارے نیند نہ آتی تھی۔ یکا یک ذہن میں ایک عجیب بات آئی۔

''یوں فاقہ کشی صریحاً خودکشی ہے' پاگل نہ بنو اور کچھ کھا پی لو۔۔۔۔۔۔''

''لیکن اگر کھانا پینا شروع کر دیا تو گھر والے مذاق اڑائیں گے اور دبلے بھی نہ ہو سکیں گے۔'' ضمیر کے ایک کونے سے آواز آئی اور یوں ضمیر اور پیٹ کی جنگ چھڑ گئی۔ کبھی ضمیر کا پلڑا بھاری ہوتا تو کبھی پیٹ کا۔ آخر کار پیٹ اور ضمیر کی جنگ میں جیت پیٹ کی ہوئی۔

ہم نے دبے پاؤں باورچی خانہ کا رخ کیا اور کھانے پر پل پڑے۔ ابھی کام و دہن کی آزمائش جاری تھی کہ یکا یک ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ سمجھے شاید الہ دین کا جن حاضر ہو گیا۔ ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا تو تمام گھر والوں کو اپنے گرد موجود پایا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اس لمحے ہم نے اردو محاورے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سر کی بجائے پیٹ پیٹ لیا اور بھیگی بلی بنے سر جھکائے باورچی خانہ سے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ پیچھے پیچھے گھر والے ''تعاقب'' کر رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ لیکن کافی دیر تک قہقہوں کی سمع خراش آوازیں آتی رہیں۔

اس بات کو گزرے عرصہ ہوا۔ ہم نے ورزش اور ڈائٹنگ کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے جسم پر تا حال کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ آج کل ہمارا سینہ پیٹ سے دو قدم پیچھے ہے۔ اس حسینہ سے کبھی کبھار سرِ راہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ مسکرا دیتی ہے۔ ہم اس مسکراہٹ کا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔

◆◆◆

خرگزشت

ایک دن یونہی جی میں خیال آیا کہ کیوں نہ کسی جاندار پر کمزوری قلم آزمائیں۔ اب مسئلہ جاندار کے انتخاب کا تھا۔ اس مقصد کے لئے ہم نے عالم حیوانات کی فہرست کا بغور مطالعہ کیا' جنگلوں کی خاک چھانی' چڑیا گھروں میں جھانکا لیکن گدھے سے زیادہ معقول مخلوق ہمیں دکھائی نہ دی۔ معقول اس لحاظ سے کہ نہ یہ کتے کی طرح کاٹتا ہے' نہ بیل کی طرح ٹکر مارتا ہے۔ سارا دن کام کرا لو لیکن اف تک نہیں کرتا۔ بس کبھی کبھی ڈھینچوں ڈھینچوں کر لی اور پھر چپ سادھ لی۔ کسی نے پوچھا کہ گدھا بار برداری کے علاوہ بھی کسی کام آتا ہے؟ ہم نے کہا ''بار برداری کے علاوہ گدھا شہ سواری کے کام آتا ہے۔ ضرورت مند لوگ اسے مصیبت کے وقت باپ بھی بنا لیتے ہیں۔'' یہ سن کر وہ گدھے کی ہشت پہلو حیثیت کے قائل ہو گئے۔

یوں تو زندگی میں ہم نے بے شمار گدھے دیکھے' سینکڑوں سے پالا پڑا لیکن اس پہلے کبھی کسی گدھے کا بغور مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ اب جو مضمون لکھنے بیٹھے تو صرف اتنا یاد رہا کہ گدھا ایک سرمئی مائل کالے سے رنگ کا جانور ہے لیکن کالا تو کوا بھی ہوتا ہے۔ دال میں بھی تو کالا کالا ہوتا ہے' اپنے مرزا جی کی رنگت بھی سیاہ ہے تو کیا ہم انہیں بھی اس قبیل میں شمار کریں؟۔۔۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔ ہم گدھے کی بیرونی وضع قطع یکسر بھول گئے۔ ایک صورت تھی عجب' یاد نہیں۔ سوچنے لگے کہ گدھے پر کیا لکھیں' کیا نہ لکھیں۔ چنانچہ اس جانور کی شکل وصورت اور عادات وخصائل پر تحقیق کی غرض سے ہم للو کمہار کے ہاں گئے اور گدھا دیکھنے کی فرمائش کی۔ یہ سن کر اس نے ہمیں عجیب نظروں سے گھورا۔ شاید اسے ہماری ذہنی صحت پر شک گزرا۔ وہ کچھ سوچ کر اندر گیا اور گدھا لا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دیا' کہنے لگا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے ''خر'' کو دیکھتے ہیں

شعر سن کر ہم نے للو کمہار کے ادبی ذوق کی تعریف کی۔ اس پر وہ مسکرایا۔ ہم آگے بڑھے' گدھے کے بالمقابل جا کھڑے ہوئے اور اس ''بھلے مانس'' کا بغور مشاہدہ کرنے لگے۔ ابھی ہماری تحقیق جاری تھی کہ للو کی آواز سنائی دی۔

''آپ کو اس جانور میں کیا خاص بات دکھائی دی ہے' آخر مجھے تو بتائیے''

''دیکھو للو! سب گدھے ایک جیسے ہوتے ہیں' قد میں یہ گھوڑے سے ذرا چھوٹا اور خرگوش سے خاصا بڑا ہوتا ہے۔ ہر گدھے کی چار

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ٹانگیں ہوتی ہیں۔ دولتی مارنے کا فعل یہ پچھلی دو ٹانگوں سے انجام دیتا ہے۔ ان کی ناک انڈر گراؤنڈ ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں ناک کٹنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اس کے دو لمبے لمبے کان اور دو ہی بڑی غزالی آنکھیں ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے پیچھے اور کانوں کے درمیان ایک ڈبہ ہوتا ہے جس میں عقل کی بجائے شاید بھوسہ بھرا ہوتا ہے۔ ہر گدھے کے اختتام پر ایک عدد دم ہوتی ہے۔'' ہم نے سرسری طور پر للو کو سمجھایا۔

''صاحب جی! گدھے کے سر پر سینگ کیسے غائب ہوئے؟'' للو نے سوال کیا۔

''للو! گدھا بنیادی طور پر شریف جانور ہے۔ یہ عدم تشدد کا قائل ہے' اس لئے دنگا فساد سے دور رہتا ہے۔ اور گدھے کے سر سے سینگ غائب نہیں ہوئے تھے بلکہ گدھا روز ازل خود ہی سینگوں سے دست بردار ہو گیا تھا تا کہ نقص امن کا خطرہ نہ رہے۔'' ہم نے جواب دیا اور للو کمہار کے ہاں سے رخصت ہوئے۔

قارئین! آپ نے اکثر گدھوں کو سڑک کے بیچوں بیچ خیالوں میں غرق کھڑے دیکھا ہوگا۔ یوں لگتا ہے جیسے مسئلہ فیثا غورث کے امکانی حل پر غور کر رہا ہو۔ کسی بھی سڑک کا چوک گدھے کا مشاہدہ گاہ بن سکتا ہے۔ چوک میں کھڑا ہو کر گدھا پہروں سڑکوں کی زبوں حالی' گاڑیوں کی تیز رفتاری اور ٹریفک سارجنٹ کی غیر حاضری کے ممکنہ اسباب سوچتا رہتا ہے۔ چلو کوئی تو ہے جو ٹریفک کے مسائل پر دلی درد کے ساتھ سوچتا ہے لیکن لوگوں کو گدھے کی یہ انقلابی سوچ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ گاڑیوں والے ہارن اور سائیکل والے گھنٹیاں بجا کر اس صاحب درد کی سوچوں میں مخل ہونے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں لیکن گدھا پھر بھی مستقل مزاجی اور شان بے نیازی سے اپنے خیالوں میں مگن رہتا ہے تاوقتیکہ تشدد اور جارحیت کا حیوان دشمن رویہ نہ اختیار کیا جائے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ للو کمہار گدھے پر سوار خراماں خراماں بازار سے گزر رہا تھا۔ یکا یک گدھے کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ سڑک کے عین وسط میں ایسا کھڑا ہوا کہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ چلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ للو نے ہزار سمجھایا' لاکھ خوشامد کی' لیکن موصوف ٹس سے مس نہ ہوئے۔ للو نے گدھے کی جناب میں دست بستہ ہو کر کہا:

جو تم چلو تو ابھی دو قدم میں کٹ جائے
جو فاصلہ مجھے صدیوں میں پار کرنا ہے

گدھے کی بدذوقی کی انتہا ملاحظہ کریں' وہ شعر سن کر بھی نہ مانا۔ آخر للو کو اس سے وہ سلوک کرنا پڑا جو پرانے زمانے کے بادشاہ دوسرے بادشاہ سے کرتے تھے۔

ہمارے مرزا لعل بیگ کو مرغیاں بہت پسند ہیں اور خاص طور پر ہمسائے کی مرغیاں لیکن گدھوں سے انہیں خصوصی نفرت ہے۔ ہم نے اس ''خربیزاری'' کی وجہ دریافت کی تو وہ ایک داستان حسرت لے کر بیٹھ گئے۔ فرمانے لگے:

''رحمان میاں' تم تو جانتے ہو کہ کلاسیکل سے مجھے کتنا شغف تھا۔ پکے راگ کے گانے کیسے ذوق سے سنا کرتا تھا لیکن اب ایک عرصہ ہوا' یہ سلسلہ ترک ہو گیا۔''

''ہاں ہاں' یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ ساز و آواز پر آپ جان چھڑکتے تھے پھر یہ شوق مدھم کیونکر ہوا؟'' ہم نے استفسار کیا۔

''کیا بتاؤں' ایک مرتبہ للو کمہار کے گھر کے پاس سے گزرا۔ اندر سے راگ کی صدا آ رہی تھی۔ شاید کوئی استاد نغمہ سرا تھا۔ آواز کے طلسم نے میرے قدم روک لئے۔ میں نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ للو کمہار باہر آیا۔ میں نے شکایت بھرے انداز میں کہا ''للو! تمہارے ہاں اتنے بڑے گلوکار آئے ہیں اور تم نے مجھے خبر نہیں کی' حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں موسیقی کا کتنا بڑا قدردان ہوں۔۔۔۔۔۔ کیا استاد سے مجھے نہیں ملواؤ گے؟''

''کیوں نہیں' مرزا صاحب؟'' للو کمہار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ پھر صحن سے گھماتے ہوئے ایک کونے میں لے گیا اور اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا''

''ان سے ملئے' یہ ہیں شہنشاہ موسیقی' پکے راگوں کے استاد۔''

سامنے اس کا گدھا منہ پھاڑے چارا رہا تھا۔ بس رحمان میاں' اس دن سے دل ایسا کھٹا ہوا کہ پھر کبھی راگ' راگنیوں پر کان نہ دھرے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ایک جانور کے ہاتھوں مجھے اتنا اعلیٰ ذوق سے محروم ہونا پڑا۔ میرا بس چلے تو دنیا کے تمام گدھوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی مار دوں۔ یوں بھی اس جدید دور میں گدھوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ دھرتی پر بوجھ ہیں' ان کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔''

ابھی ان کا طویل لیکچر جاری تھا کہ اسی دوران للو کمہار کا گدھا وہاں سے شور مچاتا' للو کو پیٹھ پر اور آسمان سر پر اٹھائے گزرا۔ یہ حرکت مرزا کی طبع نازک پر گزری اور وہ ''لاحول ولاقوۃ'' پڑھتے چلے گئے۔

قارئین کرام! گدھے کا نام ہماری روزمرہ زندگی میں ''روزمرہ'' کے طور پر مستعمل ہے۔ اپنے جملہ اوصاف کے باوجود ہمارے ہاں گدھا بیوقوفی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص دوسرے کو گدھا ثابت کرنے پر تلا رہتا ہے۔ دفتر میں افسر ماتحت سے کہتا ہے ''گدھے کہیں کے' کام دیکھ کر نہیں کر سکتے۔'' شاگرد سے استاد کہتا ہے ''کتابیں لاد دینے سے گدھے عالم فاضل نہیں بن جایا

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کرتے۔'' باپ بیٹے کو''فرزندِ خر'' کو خطاب دیتا ہے اپنے نام کا انسانی زندگی میں اس قدر گہرا عمل دخل دیکھ کر ایک زود رنج گدھے نے اخبار میں اشتہار دے ڈالا۔عبارت کچھ یوں تھی:

''براہ کرم آئندہ انسانوں کو ان کے اصل نام سے پکارا جائے تا کہ ہم گدھوں کے جذبات مجروح نہ ہو۔''

◆◆◆

تماشا بنا دیا

ہم سادہ لوح ضرور ہیں مگر احمق ہرگز نہیں' لیکن نجانے کیوں کسی بنک میں داخل ہوتے ہی ہمارے حواس ٹھکانے نہیں رہتے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا چوکیدار اور پھر اس کی اصلی بندوق دیکھ کر ہماری روح کانپ اٹھتی ہے۔سلاخوں والے دروازے اور کھڑکیاں دیکھ کر کسی جیل خانے کا پر ہول تصور ذہن پر چھا جاتا ہے۔اتنے ڈھیر سارے نوٹوں کا نظارہ کر کے آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول جاتی ہیں۔مگر صاحب' قسمت کے لکھے کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ہمیں بھی پچھلے دنوں بادلِ نخواستہ بنک جانا پڑا۔

تفصیل اس جمال پر ملال کی یوں ہے کہ ماہ رواں میں ہماری تنخواہ میں ایک سو دس روپے ماہانہ کا اضافہ کر دیا گیا۔سوچا اگر زوجہ محترمہ کو تنخواہ میں اضافے کا پتہ چلا تو یہ رقم بھی ان کی خواہشوں اور فرمائشوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی' کیوں نہ اس رقم کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ذہن میں طرح طرح کے خیال آئے کہ ان روپوں کو کسی خفیہ جیب میں چھپایا جائے۔۔۔۔۔۔۔مگر۔۔۔۔۔۔۔اگر بیگم نے حسب عادت خفیہ پولیس کے انداز میں تلاشی لے لی تو۔۔۔۔۔۔کیوں نہ یہ رقم کسی دوست کے پاس رکھوا دی جائے۔۔۔۔۔۔لیکن اگر دوست کی نیت خراب ہو گئی تو۔۔۔۔۔۔یہ روپے بنک میں رکھوا دیے جائیں۔ذہن میں ایک تجویز چھلاوے کی طرح کوندی۔جس کا ڈر تھا' وہی ہو کے رہا۔ناچار سوئے بنک جانے کے لئے کمر باندھی۔

بوجھل قدموں سے گھر سے نکلے۔ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے اور بنک کے قریب اتر گئے۔چوکیدار نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے یوں گھورا جیسے ہم بنک میں ڈاکہ ڈالنے کی نیت سے آئے ہوں۔سچ پوچھیں تو چوکیدار کی کمال ''گھوراہٹ'' سے ہم ڈرے بھی' لیکن اس موقعہ پر ''خود اعتمادی'' کی کمال اداکاری کی اور چہرے پر سنجیدگی سجائے ''دخل در معقولات'' ہو گئے۔مٹھی میں ایک سو دس روپے مضبوطی سے دبا رکھے تھے۔سوچا رقم جمع کرانے کے لئے کسی ذمہ دار افسر سے رابطہ کیا جائے۔چنانچہ سامنے بیٹھے ہوئے کلرک کے پاس پہنچے۔کلرک صاحب سرو قامت اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔قد کے علاوہ ان کی ناک بھی لمبی تھی۔گھنی گھنی مونچھوں کے سائے تلے موٹے سے ہونٹ آرام فرما رہے تھے۔اس قسم کا حلیہ دیکھ کر ہم اکثر ڈر جاتے ہیں۔چنانچہ خوفزدہ لہجے میں ان سے کہا:

''کیا منیجر صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔۔تنہائی میں؟''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

"تنہائی میں" کے الفاظ بڑے رازدارانہ لہجے میں کہے۔ یہ سن کر کلرک صاحب شاہانہ انداز میں اٹھے اور ہمیں منیجر صاحب کے کمرے تک لے گئے۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے صاحب بظاہر منیجر قطعی دکھائی نہ دیتے تھے۔ موصوف جسمانی لحاظ سے خاصے کمزور تھے۔ ان کا رنگ موجودہ صحافت کی طرح تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے کسی انسان کے بجائے "یرقان" کے روبرو ہوں۔ ہم نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا "کیا آپ ہی منیجر ہیں؟"

"خدا گواہ ہے کہ اس بنک کا منیجر میں ہی ہوں" وہ پرزور لہجے میں بولے۔

"اچھا تو پھر ہم آپ ہی سے ملنے آئے ہیں۔"

"تشریف رکھیں"

ہم ان کے سامنے دھری ہوئی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموشی سے نظروں میں نظریں ڈالے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ گویا اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا۔ منیجر صاحب کی سرجوشی سرد پڑ گئی۔ تھک ہار کر خود ہی بولے "کیا آپ کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے؟"

ان کا انداز نہایت پراسرار تھا۔ شاید وہ ہمیں کوئی سراغرساں سمجھ بیٹھے تھے۔

"نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔ ہم تو کھاتہ کھلوانے آئے ہیں اور اپنا سارا سرمایہ بنک میں جمع کرانا چاہتے ہیں۔" ہم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ ایک بہت بڑی رقم جمع کرانے آئے ہیں" وہ خوشدلی سے بولے۔

اس بار بنک منیجر ہمیں کوئی سیٹھ، زمیندار یا اسمگلر سمجھ رہا تھا۔ گھبراتے ہوئے جواب دیا "آپ غلط سمجھ رہے ہیں، ہم فقط ایک سو دس روپے جمع کرانے آئے ہیں۔"

یہ سن کر انہوں نے گرگٹ (اور آسمان) کی طرح رنگ بدلا تھوڑی دیر قبل جو تیسی جبڑوں سے جھانک رہی تھی یک لخت پس پردہ چلی گئی کرخت لہجے میں پکارے۔۔۔۔۔۔ "یہ میرا کام نہیں ہے، باہر جا کر کلرک سے رابطہ استوار کریں۔"

ہم فوراً لمبے لمبے ڈگ لے کر دروازے کے قریب جا پہنچے اور دروازہ کھولنے لگے، بہتیرا زور لگایا "کھل جا سم سم" بھی پڑھا مگر دروازہ نہ کھلا۔ اسی اثنا میں منیجر صاحب کی آواز سنائی دی "دروازہ اس طرف ہے"

یہ سن کر معلوم ہوا کہ جسے ہم کھولنے میں اپنا زور صرف کر رہے تھے وہ کمرے کا نہیں بلکہ ایک بڑی الماری کا دروازہ تھا۔ فوراً اصل

دروازے کی طرف لپکے اور کلرک کے پاس جا دھمکے۔ اس کے سامنے مٹھی کھولتے ہوئے بصد ادب کہا:

"براہ کرم اس زرکثیر سے ہمارا کھاتہ کھول دیں۔"

کلرک نے یوں گھورا جیسے ہم نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہو اور پھر اس زور سے رقم ہاتھوں سے چھینی کہ ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ نوٹ گننے میں مشغول ہو گیا۔ گننے کے بعد اس نے رقم ایک اور صاحب کے ہاتھ میں تھما دی اور پھر کچھ لکھنے میں محو ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک کاپی ہمارے سامنے رکھ دی اور روکھے انداز میں دستخط کرنے کو کہا۔ ہم نے لرزتے ہاتھوں سے "بقلم خود" دستخط کئے اور پھر غیر یقینی کے عالم میں استفسار کیا۔

"کیا رقم واقعی جمع ہو گئی ہے؟"

کلرک صاحب نے چھٹانک بھر کی زبان سے کچھ نہ فرمایا مگر اپنے دس سیر وزنی سر کو مثبت انداز میں ہلا دیا۔ یہ جان کر ہمارے سر سے بوجھ ہلکا ہو گیا۔ بنک سے جلد از جلد رخصت ہونے کی ٹھانی اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے چل دیے۔ ابھی دو قدم ہی چلے تھے کہ یاد آیا کہ واپسی کے کرائے کے لئے ہماری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ سوچا دس روپے واپس نکلوا لیتے ہیں۔ الٹے قدموں سے کلرک کے پاس لوٹ آئے۔ اور لجاجت بھرے انداز میں کہا:

"ہم مبلغ دس روپے واپس نکلوانا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے غصے سے ہمیں دیکھا اور چیک بک ہاتھ میں تھما دی۔ ہم نے جلدی سے چیک پر مطلوبہ رقم درج کی اور چیک کلرک کے حوالے کر دیا۔ اس نے ایک نظر چیک پر ڈالی اور دوسری ہمارے چہرے پر اور تعجب سے پوچھا:

"بھائی صاحب! کیا آپ ساری رقم نکلوانا چاہتے ہیں؟"

ہم نے فوراً چیک پر نظر ڈالی تب احساس ہوا کہ گھبراہٹ میں ہم نے دس روپے کی بجائے ایک سو دس روپے لکھ دیئے ہیں۔ لیکن اب صورت حال اس قدر نازک ہو گئی تھی کہ بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ اس پریشانی سے فوری نجات حاصل کرنے کے لئے ہم نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا اور تقریباً چلاتے ہوئے کہا "جی ہاں! ساری رقم"

کلرک نے اپنا سوال دہرایا "کیا آپ واقعی اپنی ساری رقم واپس لینا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ہاں ایک ایک پائی واپس لیں گے"

ہم آواز میں کرختگی پیدا کرتے ہوئے بولے۔ یوں چیخنے چلانے کی آواز سن کر بنک کا سارا عملہ ہمارا منہ تکنے لگا۔ ہم ایک چالاک

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

چور کی طرح الٹا کوتوال کو ڈانٹنے لگے۔ ہماری حتی المقدور کوشش تھی کہ ان کو ایسا تاثر دیں کہ جیسے کسی نے ہماری شان میں گستاخی کی ہو اور ناراض ہو کر ہم بنک کو ایک خطیر رقم سے محروم کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ کلرک شاید ہمارے جاہ وجلال سے مرعوب ہو گیا۔ نرم لہجے میں پوچھنے لگا:

''جناب! آپ رقم کس صورت میں لیں گے؟''

''سو سو روپے کے نوٹوں میں'' ہم نے بنا سوچے سمجھے جواب دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے سو روپے کا واحد نوٹ ہمارے ہاتھ میں دیا اور خوشدلی سے پوچھا۔۔۔۔۔۔''اور باقی دس روپے؟''

اب سمجھ میں آیا کہ وہ میٹھی چھری سے ہمیں حلال کر رہا ہے کیونکہ اس کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ چنانچہ سختی سے جواب دیا:''پانچ پانچ روپے کے نوٹوں میں''

اس نے نہایت ادب کے ساتھ پانچ پانچ روپے کے دو نوٹ ہماری نذر کئے۔ ہم نے روپے سمیٹے اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔ پیچھے بنک کا سارا عملہ قہقہے لگا رہا تھا۔ کافی دور تک قہقہوں کی سمع خراش آوازیں ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔

◆◆◆

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں کرکٹ کے سوا

''کرکٹ ایک ایسا فعل ہے' سوری کھیل ہے جس میں گیارہ کھلاڑی مل کر بارہ لاکھ کے مجمع کو بیوقوف بناتے ہیں۔'' مرزا جی نے کہا

''مگران دو ایمپائروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

کہنے لگے''یہ دو ایمپائران گیارہ کھلاڑیوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔''

ہم نے جب بھی مرزا لعل بیگ سے کرکٹ سے متعلق کوئی سوال کیا' انہوں نے ایسے ہی اوٹ پٹانگ جواب دے کر ٹال دیا۔ عہد شباب میں وہ کرکٹ کے ایک اچھے کھلاڑی تھے لیکن اب کرکٹ کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ ادھر ہم پر تو جیسے کرکٹر بننے کا بھوت سوار تھا۔ اگرچہ اب تک کھیل کے میدان میں باقاعدہ طور پر نہ اترے تھے مگر صفحہ قرطاس پر ہم ایک عدد ٹیم کے اکلوتے کپتان بھی بن چکے تھے۔ اس کرکٹ ٹیم کے قیام کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے' وہ ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ جونہی موسم سرما نے موسم گرما میں قدم رکھا تو ہر طرف''کرکٹ کرکٹ'' کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ سارے شہر کو جیسے''کرکٹیریا'' ہو گیا ہو۔ کوئی ملتا تو حال احوال پوچھنے سے پہلے قومی ٹیم کا سکور پوچھتا' ڈیڑھ بجے کسی سے وقت پوچھتے تو جواب ملتا''تیس پر ایک آؤٹ'' ٹیلیفون اٹھاتے تو آواز آتی''ہیلو کتنے رنز ہوئے ہیں' ہمارے ہاں تو کم بخت بجلی چلی گئی ہے۔'' ہم دفتر گئے تو سارا عملہ کمنٹری سننے کے عمل میں مبتلا تھا۔ درسگاہیں طلباء سے خالی تھیں اور مسجدیں مرثیہ خواں نظر آئیں کہ نمازی نہ رہے۔ بازار سے گزرے تو تقریباً ہر شخص کے کاندھے پر ریڈیو سوار کھسر پھسر میں مشغول تھا جبکہ گھروں میں ایک کثیر تعداد ٹی وی کے سامنے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر چوکا بیٹھی دکھائی دی۔ ہم بھلکڑ میاں کے گھر گئے تو وہ بھی ٹی وی کے آگے جتے بیٹھے تھے۔ برائے یک ساعت نظر کرم فرمائی اور پھر ٹی وی کی طرف نظریں پھیر لیں۔ جوں جوں کھیل میں گرمجوشی بڑھتی' ان کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا۔ ادھر کھلاڑی آؤٹ ہوتا ادھر وہ آپے سے باہر ہو جاتے۔ مخالف ٹیم کا کھلاڑی چھکا مارتا تو صاحب کے چھکے چھوٹ جاتے۔ چوکا لگتا تو ان کے دل پر جیسے چرکا لگتا۔ کوئی آدھ گھنٹہ ان کی یہ اذیت ناک حالتیں ٹک ٹک دیکھتے رہے۔ اس دوران مجال ہے جو ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ بھلکڑ میاں کی بے التفاتی سے خاصے کبیدہ خاطر ہوئے ناچار ان سے اجازت چاہی اور رخصت ہوئے۔

پاکستان کنکشنز
www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

راستے بھر یہ سوچتے رہے کہ آخر کرکٹ میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ ساری قوم محوِ تماشا ہے؟ مگر کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ معاً خیال آیا کہ کرکٹ میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہوگی' آخر اتنے سارے لوگ بے وقوف تو نہیں جب سب کرکٹ سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہم کیوں اس نعمت خاص سے محروم رہیں۔ بس پھر کیا تھا کرکٹ کھیلنے اور ٹیم بنانے کا جامع منصوبہ تیار کرنے لگے۔ ایک ٹیم میں کم از کم گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ اک کھلاڑی تو ہم تھے' مسئلہ باقی دس کھلاڑیوں کا تھا۔ چنانچہ محلے سے کرکٹ کے چند متوالوں کو اکٹھا کیا۔ یہ وہ حضرات تھے جنہیں کرکٹ سے صرف دیکھنے اور سننے کی حد تک دلچسپی تھی۔ ان کے سامنے با آواز بلند تقریر شروع کر دی:

''اے کرکٹ کے دیوانو! کب تک ٹی وی پر کرکٹ کے میچ دیکھ دیکھ کر خرچ ہوتے رہو گے؟ کب تک دوسروں کے چوکوں پر سیٹیاں بجاؤ گے؟ اور کب تک اوروں کے چھکوں پر تالیاں پیٹتے رہو گے۔۔۔۔۔۔؟؟؟''

ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ چاروں طرف تالیاں بجنے لگیں۔ ہمارے حق میں زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس لمحے ایسا محسوس ہوا کہ ہم شاید کوئی سیاسی لیڈر ہوں۔ چنانچہ ہاتھ ہلا ہلا کر ان کے نعروں کا جواب دیا' خاموش ہونے کی تلقین کی اور گویا ہوئے ''شمع کرکٹ کے پروانو' کرکٹ کے سنسنی خیز لمحات دیکھ کر تمہارا خون بھلا کیوں جوش مارتا ہے؟ وہ اس لئے کہ تمہارے اندر ایک کرکٹر موجود ہے' اسے باہر نکالو۔''

یہ سن کر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ یوں لگا جیسے واقعی کرکٹر باہر نکل رہے ہیں۔ مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ہم نے تقریر جاری رکھی:

''بھائیو' کرکٹ کھیلو۔۔۔۔۔۔ ہاتھوں سے تالیاں مت پیٹو' باؤلنگ کراؤ' منہ سے سیٹیاں مت بجاؤ' آؤٹ کی اپیلیں کرو' کرکٹ کھیلنے کے لئے ہے دیکھنے کے لئے نہیں۔۔۔۔۔۔ تم میں سے کون یہ کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔۔۔۔۔۔''

اس پر سب نے بیک آواز لبیک کہا' انہیں گنا تو درجن بھر نکلے۔ ایک صفحہ پر ہم نے سب کھلاڑیوں کے نام لکھ لئے۔ اس طرح ایک کرکٹ ٹیم تشکیل پا گئی۔ اس لمحے بلا تامل ہم اس ٹیم کے بلا مقابلہ کپتان منتخب ہوئے' اس منصب اعلیٰ پر تفویض ہو کر ''پتلون'' میں پھولے نہیں سمائے۔

اب ایک اہم مسئلہ درپیش تھا اور وہ تھا' کھیل کے اصول وضوابط سے آشنائی۔ چنانچہ مرزا جو ماضی میں کرکٹ کے کھلاڑی رہے

ہیں۔ ان سے ملے' کرکٹ کے اصول واصطلاحات سے متعلق سوالات کئے۔ ان کے جواب بہت عجیب وغریب تھے۔

پوچھا ''فیلڈ میں سلی پوائنٹ سے کیا مراد ہے؟''

گویا ہوئے ''سلی پوائنٹ کا مطلب ہے نقطہ حماقت' اور یہاں جو کھلاڑی فیلڈ کرتا ہے وہ نرا احمق ہوتا ہے۔''

''ارے بھئی! بلے باز کے قریب کھڑا ہونا حماقت نہیں تو کیا ہے' اگر کسی تیز شاٹ سے گیند جسم پر لگ جائے تو زخمی ہونے کا خطرہ ہے۔''

''کور'' کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔۔۔۔ استفسار کیا۔

''کور کا مطلب ہے' ڈھکن''

''اور ایکسٹرا کور؟''

''فالتو ڈھکن'' مرزا مسکراتے ہوئے بولے

''اچھا گلی سے کیا مراد ہے؟''

''گلی سے مراد سٹریٹ ہے۔ انگریز' کرکٹ جن کا قومی کھیل ہے' جانے کیوں اس پوزیشن کو اردو نام دینے پر مصر ہیں۔''

مرزا کے اس قسم کے جوابات سن کر سر چکرا گیا' ذرا خاموش ہوئے تو شرارت سے بولے ''بھئی کچھ اور پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔''

''تمہیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں' ہم بے زار بیٹھے ہیں''

ہم نے یہ کہا اور رخصت ہوئے۔ سیدھے ایک کتاب گھر میں جا گھسے۔ کرکٹ سے متعلق چند مفید کتابیں خریدیں اور تمام کھلاڑیوں میں تقسیم کر دیں۔ سب دن رات کتابوں کو رٹنے میں مصروف ہو گئے۔ صرف دو ہی دن میں الف سے یے تک کرکٹ کے قوانین ازبر ہو گئے۔

اگلے روز تمام کھلاڑی ہمارے گرد جمع ہوئے اور یک زبان ہو کر کہنے لگے ''ہم کسی بڑی ٹیم سے میچ کھیلنا چاہتے ہیں باؤلر وکٹیں لینے اور باؤنسر مارنے کے لئے بے قرار ہیں جبکہ بلے باز سنچریاں بنانے کے لئے بے چین ہیں اور ''رنز'' بے تاب ہیں بلوں سے نکلنے کے لئے۔۔۔۔۔۔ کپتان صاحب! جلد از جلد ون ڈے میچ کا انعقاد کیا جائے۔''

کھلاڑیوں کا جذبہ دیکھ کر ہمارے خون نے بھی جوش مارا۔ چنانچہ ایک مقامی ٹیم سے میچ کھیلنے کی درخواست کی۔ یہ میچ جمعہ کے دن ہونا تھا گویا ہمارے پاس پریکٹس اور تیاری کے لئے صرف تین دن تھے۔ ان تین دنوں میں کھلاڑیوں نے دن رات ایک کر دیا۔ خوب محنت کی۔ سب جمعہ کی صبح کے بے چینی سے منتظر تھے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

آخر جمعہ کا دن بھی آ پہنچا۔ تمام کھلاڑی صبح سویرے سفید پوشاکیں زیب تن کئے میدان عمل میں پہنچ گئے۔ پہلے پہل ٹاس ہوا۔ ہم نے ٹاس جیت لیا یہ پہلی کامیابی تھی۔ حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے مخالف ٹیم کو کھیلنے کی دعوت دی گئی۔ میچ تیس تیس اوروں پر مبنی تھا۔ ان تیس اوروں میں باؤلروں کی وہ گت بنی کہ انہیں ڈبے کا دودھ یاد آ گیا۔ وکٹیں لینے کے سپنے ''چھچھڑوں کے خواب'' ثابت ہوئے۔ سونے پہ سہاگہ فیلڈروں نے فیاضی برتتے ہوئے لاتعداد کیچ چھوڑے۔ بہرحال ہم نے بذات خود اچھی فیلڈ کی اور فقط نصف درجن کیچ ڈراپ کئے۔ تیس اوورز ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا اور کوئی تین گھنٹوں بعد مخالف ٹیم کی باری اختتام پذیر ہوئی۔ مقررہ اوروں میں انہوں نے دو سو پچاس رنز بنا ڈالے۔

وقفے کے بعد ہماری باری تھی۔ اوپنر نگاہ بلند' سخن دلنواز' جاں پرسوز لئے وکٹ پر پہنچے۔ مخالف باؤلروں نے باؤنسروں سے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ کبھی ان کے سر سے گیند ٹکراتے بچتی تو کبھی سر گیند سے۔ دونوں بلے باز پسینے سے شرابور باؤلر کے سامنے سراپا سوال تھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ باؤلروں کے تیوروں سے یوں لگتا تھا جیسے کہہ رہے ہوں۔۔۔۔۔۔ ''ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟''

اسی دوران میں ایک کھلاڑی دامن پہ کوئی چھینٹ اور بلے پہ کوئی داغ لئے بغیر آؤٹ ہو گیا۔ دوسرا بلے باز گیا تو ایک عدد باؤنسر سے اس کا استقبال کیا گیا۔ وہ اتنا ڈرا کہ اگلی گیند پر وکٹیں چھوڑ دیں اور بولڈ ہو گیا۔ اس پر باؤلر نے شرارت آمیز لہجے میں کہا:

''جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا''

ہم نے پانچویں نمبر پر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اب ہماری باری تھی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا' ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بظاہر خود پر قابو پایا اور خراماں خراماں وکٹ کی طرف چل پڑے۔ باؤلر نے بھاگنا شروع کر کیا تو ہم نے ''جل تو جلال تو'' کا ورد شروع کر دیا۔ جونہی اس نے گیند پھینکی تو اس زور سے بلا گھمایا کہ گیند بلے سے ٹکرا کر پلک جھپکتے ہی باؤنڈری لائن پار کر گئی۔ اس کرشمے پر سب لوگ بہت حیران ہوئے۔ اس چوکے سے سارا خوف دور ہو گیا۔ اب ہم کریز پر ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ دوسری طرف باؤلر غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اگلی گیند پر اس زور سے باؤنسر مارا کہ اگر ہم بروقت نہ جھکتے تو سر کا شیرازہ بکھر جاتا۔ اس پر باؤلر کو مزید غصہ آیا۔ اس نے اگلی گیند کے لئے بھاگنا شروع کیا۔ ایمپائر کے قریب سے گزرا اور زور سے ایک مزید باؤنسر مارا' ہم جھکے مگر چٹاخ سے کوئی چیز سر سے ٹکرا گئی' آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ تیورا کر گر پڑے' ہوش آیا تو دیکھتے ہیں کہ میدان کی بجائے بستر پر پڑے ہیں۔ تمام کھلاڑی ہمارے گرد اکٹھے ہیں۔ ان کے چہرے سے وحشت عیاں تھی' ہم نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر میں شدید درد ہوا۔

دونوں ہاتھوں سے سر کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ سب اسی باؤنسر کا قدرتی نتیجہ تھا۔ اس دن سے سب نے کرکٹ کھیلنے سے توبہ کر لی۔ کوئی ایک ہفتے بعد سر کا زخم مندمل ہوا۔ غسل صحت کے بعد گھر سے نکلے۔ باری باری سب کھلاڑیوں کے ہاں گئے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ سب ٹی وی پر میچ دیکھنے میں منہمک تھے۔

◆◆◆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فرام اے ریلوے کیرج

ریل گاڑی میں رات کا سفر کرتے ہوئے مجھے نیند کم کم ہی آتی ہے۔ بار بار سر پٹکنے' پلکیں جھپکنے' جمائیاں لینے اور جھوٹ موٹ آنکھیں موندنے کے بعد ہی نیند کی دیوی کو ترس آتا ہے۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ اکثر ہمسفر کب کے سو چکے تھے لیکن میں جاگ رہا تھا۔ البتہ جاگنے کی حالت میں سونے کی جدوجہد جاری تھی۔ آخر یہ کوششیں رنگ لائیں اور میں واقعی سو گیا۔ لیکن ابھی بمشکل پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک فقیر کی پرسوز بلکہ دلدوز تقریر نے بیدار کر دیا۔ کاش! سودا کی طرح اپنے بھی خدام ادب ہوتے جو اس نابکار کو خبردار کرتے کہ ابھی آنکھ لگی ہے۔ لیکن جناب اپنی ایسی قسمت کہاں؟ وہ فقیر نہایت بے باکی سے کسی بپھرتے ہوئے قوال کی مانند کمال نطق کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اس کا یہ مظاہرہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر سے ملتجی لہجے میں کہا:

''کرتا کوئی اس بندہ گستاخ کا منہ بند''

یہ حضرت خطرناک حد تک جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے' میری گزارش کے جواب میں فرمایا:

''بھائی! تقریر کرنا اس کا جمہوری حق ہے اور وہ اپنے حق کا مناسب موقع پر استعمال کر رہا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ لاتعلق ہو کر بیٹھ گئے۔ میں سوچنے لگا کہ جمہوریت کے باب میں ہمیشہ حقوق کی بات کی جاتی ہے فرائض کا ذکر آتے ہی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ فرض بھی ادا نہیں ہو پا رہے۔۔۔۔۔۔ ''کبوتر'' سے جہانگیر' نور جہاں اور شورش کاشمیری بیک وقت یاد آ گئے۔ صاحبو! وہ واقعہ تو آپ نے بھی سنا ہو گا کہ جب جہانگیر نے نور جہاں سے استفسار کیا ''کبوتر کیسے اڑ گیا؟ تو یہ سوال سن کر اس نے اک ادائے معصومی سے دوسرا کبوتر بھی ہوا میں چھوڑ دیا اور کہا ''یوں''۔۔۔۔۔۔ (سن کر ستم ظریف نے اس کو اڑا دیا کہ یوں)

اس ''یوں'' پہ جہانگیر فدا ہو گیا اور نور جہاں کو قید شریعت میں لا کر ملکہ کے منصب سے سرفراز کیا لیکن شورش کا بیان ہے کہ یہ ادا نور جہاں سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ غلط طور سے کسی راوی نے اس سے منسوب کر دیا۔ درحقیقت نواب زین خان بہادر کی دختر صاحب جمال کے ہاتھوں سے کبوتر اڑے تھے۔ اس تحقیق کے بعد مجھے ''ہاتھوں کے طوطے اڑنا'' والے محاورے میں بھی کوئی گڑبڑ

نظر آتی ہے۔ خیر اب تو صاحب جمال نور جہاں دونوں اگلے جہاں پہنچ چکی ہیں' وہ کبوتر بھی لقمہ آدم یا اجل بن چکا ہو گا اور وہ دروغ گو راوی بھی کب کا اپنی گردن سمیت درگور ہو گیا۔ اس لئے اس قصے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

اسی دوران میں گاڑی ایک اسٹیشن پر آ کر ٹھہر گئی۔ ٹرین کے رکتے ہی مسافروں کے ایک لشکر نے ٹولیوں کی صورت میں مختلف بوگیوں پر دھاوا بول دیا۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ وہ پہلے سوار ہو۔ اس کوشش میں مسافروں نے (ایک دوسرے کو) خوب ہاتھ پاؤں مارے۔ خاصی دھکم پیل کا مظاہرہ کیا گیا' دھینگا مشتی بھی ہوئی۔ ایک دو جے سے وہ سلوک کیا گیا جو لکھنو کے رجب علی بیگ سرور کے بقول دہلی کے روڑے میر امن نے محاوروں کے ساتھ برتا تھا۔ ہائے' نہ رہے وہ لکھنو کے نواب اور ان کے تکلفات۔ کیا لوگ تھے اور کیا دور تھا کہ نصف نصف گھنٹہ گاڑی کے دروازے کے قریب کھڑے آپس میں ''پہلے آپ پہلے آپ'' کی تکرار رہتی' تکلفات برتے جاتے' جب تک ٹرین اگلے اسٹیشن نہ پہنچ جاتی ان کے آداب ختم نہ ہوتے۔ ادھر جب میں نے ٹرین میں سوار ہونے والے حضرات کی کشمکش دیکھی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ فی زمانہ گاڑی میں سوار ہونے کے لئے مسافر کے پاس چیتے کے جگر اور شاہین کے تجسس کے علاوہ گینڈے جتنی طاقت اور گدھے جیسی دولتی کا ہونا ضروری ہے۔

◆◆◆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسافر

گاڑی کے تازہ واردان میں بچے' بوڑھے' خواتین اور جوان سبھی شامل تھے۔ جس کے جہاں سینگ سمائے' اس نے وہاں ڈیرہ ڈال لیا۔ وہ تو شکر ہوا کہ اسٹیشن پر کچھ لوگ اترے بھی' ورنہ خاصی مشکل صورتحال پیدا ہو جاتی۔ میں نے سرسری انداز میں تمام مسافروں کا جائزہ لیا۔ اسی اثناء میں میری نظر سامنے بیٹھی ہوئی ایک پری جمال دوشیزہ پر پڑی۔ حیرانی ہوئی کہ ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔ شاید یہ بنت مہتاب نئے آنے والے مسافروں میں سے تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو پلکیں جھپکنا بھی یاد نہ رہا۔ ان چند ساعتوں میں تو سن دل پر سوار ہو کر کہاں کہاں کی سیر نہ کی۔ آنکھوں نے ایسے ایسے خواب بنے کہ اگر وہ شرمندہ تعبیر ہو جاتے تو وارث شاہ کو عالم بالا میں ایک اور ''ہیر'' لکھنا پڑتی۔ اسی دوران دھیان اپنے ہم سفروں کی طرف چلا گیا۔ دل میں خیال آیا کہ لوگ میری وارفتگی کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ میں دزدیدہ نگاہوں سے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جواں مردوں کی ایک کثیر تعداد بھی محو تماشائے حسن تھی۔ اکٹھے اتنے سارے رقیبوں کو دیکھ کر میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ بیک وقت ان تمام سے نمٹنا اپنے بس سے باہر تھا۔ اس لئے فوری طور پر جملہ رقیبو کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا اور ایک ہاتھ دل پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیگ سے ناول نکالنے لگا۔

گاڑی تقریباً ایک گھنٹہ تک متوازن رفتار سے چلتی رہی۔ اس عرصے میں میں نے آدھا ناول ختم کر لیا۔ یکا یک گاڑی کی رفتار مدھم پڑنے لگی اور پھر وہ ایک جگہ پر آ کر رک گئی۔ دور دور کسی اسٹیشن کے آثار بھی نظر نہ آتے تھے۔ معلوم ہوا کہ گاڑی کے رکنے کی وجہ اپ سگنل ہے۔

کافی دیر بعد سگنل ڈاؤن ہوا' گارڈ نے وسل بجائی اور خدا خدا کر کے ٹرین دوبارہ چلی۔ تمام مسافروں نے سکھ کا سانس لیا۔ میں نے ایک سرد آہ بھری اور کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھنے لگا۔ رات کافی گزر چکی تھی اور اب صبح کی سپیدی تاریکی پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ میرا سفر بھی اب تمام ہونے کو تھا۔ ادھر سورج روشنی کے سفر پر روانہ ہونے کے لئے اپنے اسٹیشن (مشرق) سے رخصت ہو رہا تھا اور ادھر ٹرین اپنی منزل پر پہنچ رہی تھی۔ جب میں گاڑی سے اترا تو چاروں طرف اجالا پھیل چکا تھا۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر

وقت دیکھا تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ گویا گاڑی وقت مقررہ سے پورے تین گھنٹے لیٹ منزل مقصود پر پہنچی تھی۔۔۔۔۔۔

صاحبو! اس سفر کے بعد مجھے تو ریل گاڑی اور اقبال میں ایک قدر مشترک نظر آئی کہ دونوں دیر سے آتے ہیں۔ یاد آیا' اپنے منیر نیازی بھی تو ہمیشہ دیر کر دیتے ہیں۔ دیکھئے' انہوں نے کتنے خوبصورت لفظوں میں اپنی اس عادت کا اعتراف کیا ہے:

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں

ضروری بات کہنی ہو کوئی وعدہ نبھانا ہو

اسے آواز دینی ہو اسے واپس بلانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

یہاں اردو زبان کا ذکر کرنا بھی بے محل نہ ہوگا جو کافی دیر سے آتی ہے بلکہ آتے آتے ہی آتی ہے۔ ارے ہاں' ہماری پولیس بھی تو موقعہ واردات پر اکثر دیر سے پہنچتی ہے۔

قارئین! شاید میں پٹڑی سے اترتا جا رہا ہوں' اس لئے سلسلہ تحریر یہیں ختم کرتا ہوں۔

◆◆◆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

نگہ ناز ہے بکرے سے خفا

منڈی پہنچے تو وہاں کا دستور نرالا دیکھا۔ ہمیں ہر شخص کے ہاتھ میں ایک رسی دکھائی دی اور رسی کے اختتام پر ایک عدد بکرا گھستا نظر آیا' کیونکہ اگر بکرے کا مالک مشرق کی طرف جانا چاہتا تھا تو بکرا مغرب کی طرف۔ اس زور آزمائی کی وجہ سے ہر بکرے کا مالک زمین پر عموداً چلنے کی بجائے 75 درجے کے زاویے سے آگے کو جھک کر چل رہا تھا اور اگر اس حالت رکوع میں 5 کو بکرا فرض کر لیا جائے تو مالک کو 7 کے ہندسے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

ذرا آگے بڑھے تو ایک شخص نے ہمیں روکا اور پوچھا ''کیا چاہیے صاحب؟''

''بکرا خریدنا ہے''

''یہ دیکھئے'' اس نے کسی معصوم مخلوق کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا چیز ہے؟''

''بکرا ہے سرکار'' اس نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''اگر بکرا ہے تو اس کے سر پر کلغی کیوں ہے؟'' ہم نے اس جانور کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جسے وہ بکرا قرار دے رہا تھا۔

''یہ کلغی نہیں جناب' سینگ ہیں سینگ''

اس بحث کے دوران اس حیوان ناطق کے منہ سے ''میں میں'' کی بکرانہ آواز نکلی تو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ جانور واقعی بکرا ہے۔ ہم اسے ماہر قصابوں کی طرح ٹٹولنے لگے۔ پہلے اس کے منہ میں جھانکا' دانتوں کی گنتی کی' پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ہاتھ جماتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا لو گے؟''

''صرف تین ہزار روپے' وہ بھی آپ کے لئے''

''میرے لئے کیوں؟ میں کیا بکرے کا رشتہ دار ہوتا ہوں؟ ۔۔۔۔۔۔ یوں بھی تم ایک مرغ جتنے بکرے کو ہاتھی کے بھاؤ

فروخت کر رہے ہو۔ ہم اتنے مہنگے داموں اسے نہیں خرید سکتے۔''

''صاحب جی! یہ ایک بکرا جسے تو گراں سمجھتا ہے چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں گے تو نہیں ملے گا۔ تین ہزار روپے میں تو یہ بہت سستا ہے' ویسے آپ بتائیں کیا دیں گے؟''

''ہمارے خیال میں تین سو روپے بہت ہیں''

یہ سن کر اس نے خشمگیں نگاہوں سے یوں گھورا جیسے ہم نے بکرے کی شان میں گستاخی کی ہو۔

''اچھا تین سو پانچ روپے لے لینا' ناراض کیوں ہوتے ہو؟''

ہم نے یکدم نرخ بلند کئے تو اس کا پارہ بھی بلند ہو گیا' آگ بگولہ ہو کر کہنے لگا۔۔۔۔۔۔ ''آپ بکرا خریدنے آئے ہیں یا اس کی دم؟''

اس طویل بحث سے ''مرحوم'' کی یاد تازہ ہو گئی جسے پطرس نے فروخت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ لیکن اس مرتبہ تاریخ نے ''خواب جوانی'' کی تقلید کی اور خود کو دہرانے کی کوشش ہرگز نہ کی۔ یوں مبلغ دو ہزار روپے میں سودا طے پا گیا۔ ہم نے بکرا خرید لیا۔ رسی ہاتھ میں تھامی اور سطح زمین پر 75 درجے کے زاویے سے سفر کرنے لگے۔

بچپن میں ایک مرتبہ ہمارے دل میں میمنا پالنے کی آرزو پیدا ہوئی مگر والدین کی ضد کے آگے ایک نہ چل سکی اور رہیں دل کی دل ہی میں حسرتیں۔ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے' یہ خواہش بھی پرورش پاتی رہی اور اب جوانی میں میمنا پالنے کی حسرت نے بکرے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اب ہم خود مختار تھے اور اپنی نازک مزاج بیگم کی مرضی کے مطابق ایک الگ مکان میں ''پرسکون'' زندگی بسر کر رہے تھے۔ گزشتہ کئی دنوں سے ہماری دیرینہ اور تشنہ آرزو مسلسل انگڑائیاں لے رہی تھی اور آخر کار ہم ۔۔۔۔۔۔ ''بکرے'' کو آج اپنے ہی گھر لے کے آ گئے۔

بیگم اس وقت برآمدے میں موجود تھیں' جب ہم گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھتے ہی چلائیں۔۔۔۔۔۔ ''یہ گدھا کہاں سے پکڑ کر لا رہے ہو؟''

''بیگم خدا کا خوف کرو' کیا تم بکرے اور گدھے میں تمیز نہیں کر سکتیں؟''

بولیں ''تم خاموش رہو' میں بکرے سے مخاطب ہوں''

ہم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اس خاموشی سے بیگم نے فائدہ اٹھاتے ہوئے خاصی دیر تک بکرے کے نقصانات پر روشنی اور

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

فوائد پر تاریکی ڈالتی رہیں۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مسمی بکرا اپنے قیام کے دوران سارا سارا دن گھر میں نزاکت آواز اور اشاعت براز کا مظاہرہ کرتا رہے گا جو نہ صرف ثقل سماعت کا موجب بن سکتا ہے بلکہ غارت گر نصف ایمان بھی ہوسکتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں پہلی بار ہم نے بیگم کو اپنی ساس کی کسی بات پر اتفاق کرتے ہوئے پایا۔

بیگم کی تقریر اختتام کو پہنچی تو ہم نے ''حزب اختلاف'' کی نمائندگی کرتے ہوئے ''فاضل مقرر'' کے دلائل کو شبوتوں کی مدد سے غلط ثابت کیا۔ اس کے بعد منت سماجت کی نوبت آئی اور آخر میں خوشامد کے مراحل پیش آئے۔ بیگم نے بادل نخواستہ یہ شرط عائد کرتے ہوئے بکرے کے قیام کی اجازت مرحمت فرمائی کہ گھریلو کاموں (جھاڑو دینے' برتن مانجھنے اور کپڑے دھونے) کے علاوہ بکرے کی خدمت گزاری بھی ہمارے فرائض منصبی میں شامل ہوگی۔ شرط فوری طور پر قبول کرلی گئی۔ ہم نے صحن کے ایک کونے میں لگے پانی کے نل سے اس پیارے سے جانور کو باندھا اور شفقت آمیز نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ پھر ہم نے بکرے کو ''کھاس ڈالی'' جو وہ چند منٹوں میں ہی صاف کر گیا۔ یوں اس کی خدمت میں شب و روز ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ دن گزرتے گئے' وقت کا چکر جاوداں چلتا رہا۔ اپنے ''شوق'' کو پالتے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا' فی الحال کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا جو ہماری ازدواجی زندگی میں بدمزگی کا باعث بنا ہو۔ البتہ بکرے کی ایک عادت کبھی کبھار پریشان کردیتی اور وہ تھی اس کی بے وقت کی راگنی۔ موصوف بہت خود پرست واقع ہوئے تھے۔ ہمیشہ ''صیغہ واحد متکلم'' میں گفتگو کرتے۔ وہ جب ''میں میں'' کا راگ الاپ رہا ہوتا تو بیگم کو ''تو تو'' کا موقعہ میسر آ جاتا' وہ نہایت طنزیہ انداز میں گنگناتے ہوئے کہتیں۔۔۔۔۔۔ ''بک رہا ہے جنوں میں کیا کیا کچھ''

زوجہ محترمہ اس لہجے میں یہ مصرعہ ادا کرتیں کہ فوری طور پر ذہن میں مندرجہ ذیل مفہوم پیدا ہوتا:

''بکرا جنوں میں بکواس کر رہا ہے''

اس ''مجنوں'' کو بے سری ریاضت کا ایسا چسکا تھا کہ دن کو بالعموم اور رات کو بالخصوص خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر گلے بازی کرتا۔ شاید یہ گلوکار کسی جنم میں تان سین کے ہاں پالتو جانور کی حیثیت سے زندگی بسر کر چکا تھا۔ ہم اس کی گلوکاری کی وجہ سے بے خوابی کا شکار تھے۔ رات کو ادھر ہماری آنکھ بند ہوتی' ادھر بکرے کا منہ کھل جاتا۔ چنانچہ ہم جو کبھی گھوڑے بیچ کو سوتے تھے' بکرا خرید کر نیندیں گنوا بیٹھے۔ ایسے موقعوں پر بیگم مذکورہ بالا مصرع گنگنا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتیں۔ یہ بات حیران کن تھی کہ وہ صرف اتنا ہی کہنے پر کیوں اکتفا کرتی ہیں' حالانکہ ڈھول ڈھپا اس سراپا ناز کا شیوہ بھی تھا۔ اس بات سے بے خبر تھے کہ وقت ایک ایسی حادثے کی پرورش کر رہا ہے جس کے اثرات ہمارے حق میں مفید نہیں تھے۔ اور پھر کل رات کو عجیب واردات ہوئی۔

ہوا یوں کہ خدا خدا کر کے ہماری آنکھ لگی اور اچانک پراسرار آوازوں کے شور سے کھل بھی گئی' نیند سے ہنگامی طور پر بیدار ہونے کے بعد آوازوں کی ماہیت پر کسی فلسفی کی طرح غور کرنے لگے۔ کم سے کم یہ ہمارے خراٹوں کا شور تو نہیں تھا اور نہ ہی ہمارے ہمسائے مرزا لعل بیگ کے کتے کی بھونک تھی۔ سوچنے لگے کہ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟ اسی اثنا میں فضا میں ایک دلدوز چیخ' گونجی' خوف کی ایک یخ بستہ لہر بدن میں دوڑ گئی۔ ہم نے پھرتی سے بستر کی چادر نکالی' چادر کو سرتاپا اوڑھا اور دبک کر لیٹ گئے۔ شور کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی ظالم کسی ذی نفس کا گلا بڑی بیدردی سے دبا رہا ہو۔ دہشت کے مارے ہم چپ چاپ سوئے رہے لیکن یک لخت خواہ مخواہ کا مشیر یعنی ہمارا ضمیر بیدار ہوگیا۔ دل کے ایک گوشے سے آواز آئی:

''اے مرد مجاہد جاگ ذرا' ایک انسانی جان کا سوال ہے اور تو بے خبر سوتا ہے۔ تیرا خوف بجا ہے لیکن احترام حیات بھی تو کر' مسلم خوابیدہ اٹھ' ہنگامہ آرا' تو بھی ہو''

دل میں جونہی یہ انقلابی خیالات آئے تو ہم کسی غیبی قوت سے سرشار ہو کر اٹھے۔ اس موقع پر بیگم کو جگانے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنا روایتی مصرع دہرایا۔ اس بے نیازی پر بہت طیش آیا۔ ہم اکیلے ہی اس سمت چل پڑے جدھر سے پراسرار آوازیں آ رہی تھیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک ہیولا زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا ہے اور یہ کربناک چیخیں اس کے حلق سے نکل رہی ہیں۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے' دل بیٹھ گیا اور سانس تیز تیز چلنے لگی۔ بمشکل خود پر قابو پایا اور ''ہمت مرداں مدد خدا'' کا ورد کرتے ہوئے چند قدم اور آگے بڑھے۔ جب اس بسمل ہیولے کے قریب پہنچے تو حیرت سے ہمارا منہ کھلا رہ گیا۔ ہم جسے انسانی ہیولا سمجھ رہے تھے' وہ بندہ تھا اور نہ بندے کی ذات تھی بلکہ وہ بکرے کی ذات کمالات تھی کہ لیٹے لیٹے قیامت خیز انگڑائیوں میں مصروف تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ ہم فوراً طبی معائنہ کی غرض سے اس کی طرف لپکے۔ قریب آئے تو معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ اس حالت زار کی تمام تر ذمہ داری بکرے کی چھوٹی سی ذات پر ہی عائد ہوتی تھی۔ موصوف رات بھر نل کے گرد طواف کرتے رہے' رسی نل کے گرد لپٹتی رہی اور نتیجتہً بری

طرح گلے میں پھنس گئی۔ یہ اذیت ناک حالت دیکھ کر دل موم ہوگیا۔ اسے فوراً رسی کے بندھن سے آزاد کیا' پانی پلایا اور صحن میں کھلا چھوڑ دیا۔ واپس آ کر بیگم کو تازہ ترین صورت حال سے باخبر کیا تو خفگی کی شکنیں ان کی پیشانی پر طلوع ہوئیں اور انہوں نے ناپسندیدہ الفاظ میں بکرے کو یاد کیا۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

صبح جب آنکھ کھلی تو صحن کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ اپنے گھر کو دیکھ کر دشت کی یاد آنے لگی۔ صحن میں ہر سو گھاس بکھرا ہوا تھا اور اس پر مستزاد بکرے کی مینگنیاں اور یہ مینگنیاں اس حسن ترتیب سے پھیلائی گئی تھیں کہ صحن سے گزرنے کے لئے قدموں سے ان کا معانقہ ناگزیر تھا۔ بیگم نے جب یہ نظارہ دیکھا تو ان کا پارہ چڑھ گیا اور لگیں ہمیں بے نقط سنانے۔ کھسیانے ہو کر کہا ''بیگم سنو تو۔۔۔۔۔۔''

''اب سننے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اگر پانچ منٹ تک یہ بکرا گھر سے رخصت نہ ہوا تو میں میکے چلی جاؤں گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

اور پیارے قارئین! پانچ منٹ بعد ہم بکرے کی رسی تھامے 75 درجے کے زاویے سے بکر منڈی کی طرف رواں دواں تھے۔

◆◆◆

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

امتحاں سے فارغ ہوئے ابھی بمشکل ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ابا جان کا حکم صادر ہوا ''بیکار مباش کچھ کیا کرو'' پوچھا ''کیا کریں؟'' فرمایا ''کلرکی کر' کھا ڈبل روٹی' خوشی سے پھول جا''۔۔۔۔۔۔ عرض کیا ''والد محترم! بندہ ناچیز کی تعلیمی قابلیت کے پیش نظر مشورہ دیں' صحت کو ملحوظ خاطر نہ رکھیں۔ ازلی دبلے پن کی وجہ سے ڈبل روٹی کھا کر بھی ہم سنگل پسلی ہی رہیں گے' پھول نہیں سکتے۔''

ابا جان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''تو ایسا کرو جب تک نتیجہ نہیں آتا' کسی پرائیویٹ سکول میں پڑھانا شروع کر دو۔''

بات ہمارے دل کو بھا گئی۔ چنانچہ کالونی ہی کے ایک پرائیویٹ سکول میں جا دھمکے اور پرنسپل صاحب کی خدمت میں نوکری کی درخواست جڑ دی۔ وہ بھی شاید نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے' سر آنکھوں پر بٹھایا اور چپڑاسی کو کرسی لانے کو کہا۔ کمرے میں موجود واحد کرسی پر پرنسپل صاحب خود بیٹھے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد چپڑاسی ایک بوسیدہ سی کرسی لے آیا۔ ظاہری حالت دیکھ کر ہمیں کرسی کی کسمپرسی کا احساس ہوا۔ بیٹھنے لگے تو دل بیٹھنے لگا کہ کہیں کرسی بھی زمین پر نہ بیٹھ جائے۔ مگر اس قسم کا کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ بہر حال پرنسپل صاحب نے انٹرویو شروع کیا۔ حال پوچھا' اپنا حال بتایا۔ موسم کی بوقلمونیوں پر تبصرہ فرمایا' مہنگائی کے متعلق ہماری رائے پوچھی' سیاست پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ یوں کوئی دو گھنٹے بعد انٹرویو تمام ہوا اور نوید سنائی گئی کہ ہمیں بطور استاد منتخب کر لیا گیا ہے۔ اگلے دن صبح آٹھ بجے سے ڈیوٹی پر حاضر ہونے کو کہا گیا۔ ہمیں پنجم جماعت کو ''مطالعہ پاکستان'' پڑھانے پر مامور کر دیا گیا تھا۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر سکول گئے۔ جماعت کی حاضری لینے کے بعد تدریس کا آغاز کیا اور کچھ یوں گویا ہوئے:

''پیارے بچو! روئے زمین کا بیشتر حصہ سمندروں سے ڈھکا ہوا ہے۔ زمین پر خشکی کے صرف سات بڑے قطعے ہیں۔ ان قطعوں کو براعظم کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔''

ابھی ہم نے اتنا ہی کہا تھا کہ پچھلی نشست سے ایک بچے کا ہاتھ ہوا میں لہراتا دکھائی دیا۔ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو کہنے لگا ''استاد مکرم! قطع کلامی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں' ایک سوال کا طلبگار ہوں۔ پوچھنا یہ مقصود ہے کہ براعظم اور وزیر اعظم میں کیا بنیادی فرق ہے؟ نیز ان دونوں کا سکندر اعظم سے کیا رشتہ ہے؟''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اس سوال میں ہمیں تاریخ اور جغرافیہ باہم گلے ملتے نظر آئے۔ بخدا اگر ہم مغل اعظم ہوتے تو دین الٰہی کے تحت اس گستاخ کو قرار واقعی سزا دیتے۔ خیر صبر کے گھونٹ پی گئے اور اس طالب علم کو نصیحت کی کہ آئندہ تاریخ میں روڑے اٹکانے کی کوشش نہ کرے ۔۔۔۔۔۔ہم نے دوبارہ سبق پڑھانا شروع کیا:

''سب سے بڑا براعظم ایشیا ہے۔ پاکستان ایشیا میں واقع ہے۔ پاکستان کے شمال میں چین' جنوب میں بحیرہ عرب ہے۔''

''استاد صاحب لفظ بحیرہ عرب نہیں سعودی عرب ہے۔'' کونے سے ایک نکتہ چین نے ہماری غلطی نکالی۔ بہتیرا سمجھایا کہ جنوب میں بحیرہ عرب ہے۔ یہ کسی ملک کا نہیں' ایک سمندر کا نام ہے مگر وہ مصر رہا کہ درست لفظ سعودی عرب ہے کیونکہ وہاں اس کے ماموں رہتے ہیں۔ ہم نے اس بچے کو اس کے حال پر چھوڑا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''پاکستان کی کل آبادی 9 کروڑ ہے۔۔۔۔۔۔''

ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اگلی سیٹ سے آواز آئی۔۔۔۔۔''معاف کیجئے استاد مکرم! مردم شماری ہوئے دس سال ہو چکے ہیں' کیا اس عرصہ میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا؟''

''پپو یار بچے تو ہر روز سینکڑوں پیدا ہوتے ہیں لیکن روزانہ اتنے ہی لوگ روزگار کی تلاش میں بیرون ملک چلے جاتے ہیں اس طرح آبادی کا تناسب یکساں رہتا ہے۔''

ایک حضرت پپو صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے بلند آواز میں بولے۔ پپو کے سوال پر ہمیں جو پریشانی لاحق ہوئی تھی وہ اس تسلی بخش جواب سے دور ہوگئی۔ بہرحال سلسلہ تدریس جاری رکھا:

''پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ قومی لباس شلوار قمیض اور۔۔۔۔۔۔''

''ایکسکیوزمی سر! یہ بات رانگ ہے۔'' گورے رنگ کا ایک بچہ پکارا اٹھا۔

''وہ کیسے؟'' ہم نے استفسار کیا۔

بولا''سر پاکستان میں سب سے زیادہ انگلش لینگویج بولی جاتی ہے۔ کہنے کو اردو دفتری زبان ہے مگر اس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں انگریزی کے قومی زبان ہونے کا اعلان کر دینا چاہیے۔ جھوٹ بولنا کیا ضروری ہے؟ جہاں تک قومی لباس کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ شلوار قمیض تو کوئی کوئی پہنتا ہے، ہر کوئی جینز کی پینٹ اور شرٹ پہنے نظر آتا ہے اس لئے ہمارا قومی لباس پینٹ شرٹ ہونا چاہیے۔''

یہ سن کر ہماری رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ جذبہ حب الوطنی بیدار ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ گستاخانہ لہجے پر اس کو ڈانٹ دیتے' ہماری نظر اپنے لباس پر پڑی''دوسری کو نصیحت خود میاں فصیحت'' والا معاملہ درپیش تھا۔ چنانچہ اسے صرف''شٹ اپ'' کہنے پر اکتفا کیا۔

ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ طلبہ دخل در معقولات سے باز نہیں آئیں گے۔ سوچا انہی سے سوالات پوچھے جائیں تاکہ ان کی ذہانت کا امتحان ہو جائے اور ان کے عجیب وغریب اعتراضات سے جان بھی چھوٹ جائے۔ چنانچہ اگلی سیٹ پر بیٹھے ایک بچے کو کھڑا کیا اور پوچھا''پاکستان کے کل کتنے صوبے ہیں؟''

جواب ملا''پاکستان کے کل چار صوبے ہیں لیکن سیاسی ازکانہ کی کوشش ہے کہ صوبوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ قوم میں یکجہتی کے بجائے ہمہ جہتی پیدا ہو۔''

ایک طالب علم سے ہم نے جب یہ پوچھا کہ پاکستان عوام آمدورفت کے لئے کون کون سے ذرائع استعمال کرتے ہیں تو صاحب فرمانے لگے''پاکستان کے عوام آمدورفت کے لئے غفلت کے گھوڑے استعمال کرتے ہیں۔'' پپو سے استفسار کیا''ہمارے ملک کے عوام بسر اوقات کے لئے کون سے پیشے اختیار کرتے ہیں؟'' بولا''سمگلنگ''۔۔۔۔۔۔ہم نے سر پیٹ لیا اور جب باری باری ہر کسی سے یہی سوال پوچھا تو طلباء کی طرف سے کچھ اس قسم کے جوابات موصول ہوئے:

منشیات فروشی۔۔۔۔۔ایک بولا

ذخیرہ اندوزی۔۔۔۔۔دوسرا بولا

رشوت خوری۔۔۔۔۔تیسرے نے سوچ کر جواب دیا

اور اب ہارس ٹریڈنگ۔۔۔۔۔آخری کونے سے آواز آئی۔

بچوں کے عجیب وغریب جوابات نے ہمیں بوکھلا دیا۔ سر گھومنے لگا' قویٰ مضمحل ہو گئے۔ پریشان ہو کر کمرہ جماعت سے تیر کی طرح نکلے اور پرنسپل صاحب کے دفتر میں جا کر دم لیا۔ ان کی خدمت میں بصد ادب استعفیٰ پیش کیا اور سکول سے باہر نکل آئے۔

◆◆◆

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

خطرۂ جان

آدھی رات کا وقت تھا۔ ہم بڑی بے چینی کے عالم میں بستر پر کروٹیں لے رہے تھے۔ آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی' پیشانی نم آلود تھی اور سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ ان تمام تر جسمانی احوال کی ذمہ داری درد شکم پر عائد ہو رہی تھی جو بڑی بیدردی سے حدود شکم کی دائیں جانب تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ یہ حملے تعداد کے لحاظ سے ہندوستان پر کئے گئے محمود غزنوی کے حملوں سے کہیں زیادہ تھے۔ ہم کافی دیر تک مردانہ وار مدافعت کرتے رہے۔ لیکن جب دشمن کا سامان حرب اور لشکر سیاہ زود افزوں دیکھا تو ہتھیار پھینک دیئے اور چلا کر زوجہ محترمہ کو آواز دی۔۔۔۔۔۔ ''بے... گم''

بیگم جو گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں' ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اور تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔ ''کیا ہوا منے کے ابا؟''

یہ صدائے دل چیر سن کر منا جاگ اٹھا اور منے کا ابا کانپ اٹھا۔ نحیف سی آواز میں عرض کیا ''پیٹ میں درد ہو رہا ہے''

''تو اس میں چلانے کی کیا بات ہے' خواہ مخواہ منے کو بھی جگا دیا۔ اگر زیادہ درد ہو رہا ہے تو تھوڑا سا چورن کھا لو۔'' یہ کہہ کر بھاگ بھری منے کو لوری دینے لگی۔ اور تھوڑی دیر بعد دونوں خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔

بیگم کا مفت مشورہ سن کر اٹھے اور چورن کی شیشی اٹھانے کے لئے الماری کی طرف بڑھے۔ لیکن درد کی شدت سے چلا نہ گیا۔ سوچا شیشی اٹھانے کے لئے بیگم سے کہہ دیں۔ معاً دل میں خیال آیا کہ سوئے ہوئے شیر کو جگانا مناسب نہیں۔ چنانچہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے' آہستہ آہستہ الماری کی طرف رینگنا شروع کیا۔ الماری سے چورن کی شیشی نکالی اور ایک چٹکی پھانک لی۔

کافی دیر کمرے میں ٹہلتے رہے۔ اس دوران درد میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ سونے کی ٹھانی' جونہی بستر پر لیٹے پیٹ میں درد کی اس قدر تیز ٹیس اٹھی کہ چیخ ہی نکل گئی۔ بیگم نے چیخ کی آواز سنی تو جاگ گئیں۔ اٹھ کر ہمارے قریب آئیں اور تشویش ناک لہجے میں پوچھا:

''کیا ہوا' سرتاج؟''

''سرتاج کے پیٹ میں درد ہے'' جواب دیا

''چورن سے افاقہ نہیں ہوا؟''

''نہیں''

''اللہ خیر کرے۔۔۔۔۔۔ ایسا کرو' ہسپتال چلے جاؤ''

''اتنی دور' ہم اکیلے تو نہیں جا سکیں گے'' کراہتے ہوئے کہا

''ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔۔ ہاں یاد آیا وہ اپنے نئے ہمسائے آئے ہیں نا' سنا ہے ڈاکٹر ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ اس وقت جا کر ان کو بے آرام کروں۔''

''تو کیا ہوا' آخر پڑوسیوں کے بھی تو کچھ حقوق ہوتے ہیں۔''

''لیکن ان سے تو ابھی علیک سلیک بھی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔۔ جان نہ پہچان میں تیرا مریض''

''اچھا''

ناچار ہم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ درد کی شدت سے چلنا مشکل ہو گیا' دونوں ہاتھ پیٹ پر پھیرتے' لڑکھڑاتے ہوئے چل پڑے۔ بیگم صاحبہ گیٹ تک چھوڑنے کے لئے بذات خود آئیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی ہمارے گھر سے کوئی دس پندرہ قدم دور تھی لیکن یہ فاصلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ خدا خدا کر کے سفر ٹوٹا۔ آخر ہم کراہتے' چلاتے ان کے گیٹ تک پہنچ ہی گئے۔ دیوار پر سنگ مرمر کی بڑی سی تختی لگی ہوئی تھی۔ جس پر سیاہ حروف میں ''ڈاکٹر خورشید احمد'' درج تھا۔ تختی کے اوپر ایک بلب روشن تھا جبکہ بائیں طرف گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ ہم نے پیٹ سے ایک ہاتھ اٹھا کر گھنٹی پر رکھ دیا۔

گھنٹی کی آواز سے کوٹھی گونج اٹھی۔ چند لمحوں بعد تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر یکدم کھٹاک کی آواز سے گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کی اوٹ سے ایک صاحب برآمد ہوئے۔ ہم نے فٹ سلام عرض کیا اور گویا ہوئے:

''ہم آپ کے ہمسائے ہیں۔۔۔۔۔۔''

ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بھاری سی آواز میں بولے۔۔۔۔۔۔ ''وہ آئیں ہمارے گھر میں ہمارے' خدا کی قدرت ہے۔''

''جی ہمیں ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔''

''ناچیز ہی وہ ڈاکٹر ہے جس سے آپ ملنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں' اندر تشریف لائیے نا''

یہ کہہ کر انہوں نے ہمارا ہاتھ تھاما اور مختلف کمروں اور برآمدوں سے گھماتے پھراتے ڈرائنگ روم تک لے آئے۔

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اور میز پڑا تھا۔ میز پر دوائی کی ایک شیشی' چند گولیوں کے پیکٹ اور گلاس رکھا تھا۔ سامنے شیلف میں دبیز جلدوں والی کتابیں ترتیب سے سجی تھیں' جو شاید علم طب سے متعلق تھیں۔ ہم اپنا درد بھول کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آواز سنائی دی:

''کیا دیکھ رہے ہیں جناب! بیٹھئے نا''

ہم فوراً بیٹھ گئے اور نہایت عاجزی سے بولے۔۔۔۔۔۔''ہم معذرت خواہ ہیں کہ بے وقت آپ کی نیند میں مخل ہوئے۔''

بولے''چھوڑیئے صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ تو ہمارے مہمان ہیں' خدا کی رحمت ہیں۔۔۔۔۔۔اور ویسے بھی میں ابھی جاگ ہی رہا تھا۔''

ادھر ہمارے پیٹ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں' بمشکل برداشت کرتے ہوئے بولے۔۔۔۔۔۔''شکریہ جناب! ہم اپنا تعارف کرانا تو بھول ہی گئے' ہمارا نام۔۔۔۔۔۔''

''ارے صاحب! نام میں کیا رکھا ہے' گلاب کو جس نام سے پکارو وہ خوشبو دیتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب ہماری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

''کیا نوش فرمائیں گے' چائے یا کافی؟''

عرض کیا''بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔۔بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔''

''آپ تکلف کر رہے ہیں صاحب جب سے فراز نے شعر کہا ہے لوگ اتنے محتاط ہو گئے ہیں کہ اخلاص کو بھی تکلف سمجھتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ہاہاہا''

ان کو ہنستا دیکھ کر ایک اذیت آمیز مسکراہٹ ہمارے چہرے پر بھی ابھری۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہتے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جب ان کی ہنسی تھمی تو بولے''کیا نام بتایا تھا آپ نے''

''گلاب'' بے اختیار ہمارے منہ سے نکل گیا۔ پھر فوراً جھینپ کر کہا''جی ہمیں رحمان کہتے ہیں''

''واہ رحمان صاحب آپ تو خاصے بذلہ سنج معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی ہماری جمے گی' خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو''

''جی ہاں بالکل آپ بھی خاصے خوش مذاق آدمی نظر آتے ہیں''

''یہ تو وہی بات ہوئی: من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو۔۔۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔۔۔یوں لگتا ہے جیسے ہم دونوں''انجمن ستائش باہمی'' کے ارکان ہوں''

ڈاکٹر صاحب تو عرض مدعا کا موقعہ ہی نہیں دے رہے تھے' ادھر ہمارے بحر شکم میں درد کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کچھ کہتے' گویا ہوئے:

''رحمان صاحب! آپ کے آنگن میں کتنے پھول ہیں؟''

''بے شمار پھول ہیں' گلاب کے' موتیا کے' سورج مکھی اور گیندے کے۔۔۔۔۔۔آج کل بہار ہے اس لئے سب پودوں پر پھول کھل رہے ہیں۔''

یہ سن کر انہوں نے ایک غیر معمولی قہقہہ لگایا۔ قہقہے کی طوالت اور زوردار کھنک سے لگتا تھا جیسے جنگل کا بگل بج رہا ہو۔ اس فعل میں منہ کے علاوہ سر' پیٹ' چھاتی اور ٹانگیں بھی ملوث تھیں اور ان کا تمام جسم ہچکولے کھا رہا تھا۔ ہنستے ہنستے ہی بولے:

''ارے صاحب' ہم آپ سے... ہاہاہا... ہم آپ سے بچوں کی تعداد پوچھ رہے ہیں اور آپ پھولوں کے متعلق بتا رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔ہاہاہا''

''جی ایک بیٹا ہے ہمارا۔۔۔۔۔۔منا'' ہم خفت مٹاتے ہوئے بولے

''ماشاءاللہ خدا عمر دراز کرے'' انہوں نے وضع داری نبھانے کے لئے چند دعائیہ کلمات ادا کئے۔ ادھر ہمیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے چہرے سے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب انہیں اظہار تشکر سمجھ کر مسلسل نظر انداز کر رہے تھے۔ انہیں تو شاید انٹرویو کا شوق تھا۔ بولے:

''رحمان صاحب کیا شغل ہے آپ کا؟''

عرض کیا''امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے''

فرمانے لگے''پھر تو آپ کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں گی''

''لیکن اس وقت ہمارے پیٹ میں۔۔۔۔۔۔'' ہم درد کی شدت سے کراہتے ہوئے اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری بات کاٹ کر کہنے لگے۔۔۔۔۔۔''صاحب' اس پاپی پیٹ کی بدولت تو نظام حیات قائم ہے۔ غم روزگار اگر نہ ہو تو زندگی بے مقصد' بے کیف ہو جائے' زندگی کی تمام گہما گہمی اور ہنگامہ آرائی اس کے دم قدم سے ہے۔''

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

ابھی ان کا طویل لیکچر جاری تھا کہ یکا یک ہمارے پیٹ کے دائیں جانب اس زور سے درد کی لہر اٹھی کہ چیخ ہی نکل گئی۔ تکلیف اب ناقابل برداشت تھی۔ ہم پیٹ پکڑے صوفے پر ہی لوٹ پوٹ ہو گئے اور پھر تیورا کر فرش پر گرے تو کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے پہلے ڈاکٹر صاحب کی آواز سنائی دی ''رحمان صاحب کیا ہوا' رحمان صاحب''۔۔۔۔۔۔ مگر ہم وہاں پہنچ چکے تھے جہاں سے خود اپنی خبر نہیں آتی۔

ہوش آیا تو سامنے بیگم صاحبہ کی دھندلی سے شبیہ نظر آئی۔ کھڑکی سے آنے والی سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں چہرے پر تھپکی دے رہی تھیں۔ ہماری آنکھیں کھلتی دیکھ کر بیگم اپنے آنسو پونچھتی ہوئی سرہانے آ کھڑی ہوئیں اور روہانسی آواز میں بولیں:

''خدا کا شکر ہے' سرتاج تم بچ گئے۔۔۔۔۔۔ تمہارا اپنڈکس کا آپریشن ہوا ہے بھلا ہو ڈاکٹر صاحب کا وہ بروقت تمہیں یہاں ہسپتال لے آئے ورنہ۔۔۔۔۔۔'' ورنہ... کے بعد وہ کافی دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔ پھر روتے روتے کہنے لگیں:

''سرتاج! ڈاکٹر صاحب وہ ڈاکٹر نہیں جو ہم سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے تو اردو ادب میں پی ایچ ڈی کیا ہوا ہے۔ بڑے نیک آدمی ہیں کہہ رہے تھے کہ پھر آؤں گا۔''

بیگم کی زبانی یہ بات سن کر ساری کہانی سمجھ آ گئی۔ گزشتہ رات کے واقعات فلم کی مانند پردہ ذہن پر گھومنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو یاد آنے لگی۔ ہمارے دل میں ہول اٹھنے لگا۔ خدا کا شکر بجالائے کہ جان بچ گئی۔

اسی اثناء میں دروازے میں ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔ قریب آئے تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی نکلے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولے:

''کیسے مزاج ہیں' رحمان صاحب؟''

عرض کیا:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

مصرع ثانی ہم نے زور دے کر پڑھا۔ شعر سن کر انہوں نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔ ہم نے بھی قہقہہ لگانے کی کوشش کی مگر پیٹ پر لگے ٹانکوں میں درد ہونے لگا' اس لئے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

◆◆◆

آیئے! راز عمر دراز پایئے

حق مغفرت کرے' آغا صاحب نے ناحق خود کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ بظاہر ان کی وفات ایک اتفاقی حادثہ نظر آتی ہے اور اب تک اس سانحہ کا صرف ایک سبب منظر عام پر آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت نے برسوں اس حادثہ کی پرورش کی۔ دراصل ایک مدت سے انہیں صحت مندی کا ''عارضہ'' لاحق تھا۔ تندرستی کے حصول کے لئے وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیا کرتے تھے اور اف تک نہ کرتے۔ موسم سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی صبحوں کو مرحوم یخ پانی سے غسل کرتے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ عمل بدن کے مسام کھولتا تھا۔ نہانے کے بعد وہ اسفنج سے پورے جسم کا گرم مساج کیا کرتے اور اس عمل کی توجیہ یہ بیان کرتے کہ اس طرح ان کے بدن کے مسام بند ہوتے ہیں۔ ان حرکتوں میں انہیں اتنی مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ اپنے مسام اپنی مرضی کے مطابق بند کر لیتے اور جب جی چاہتا کھول لیتے۔ غسل کے بعد وہ صرف جانگیہ پہن کر کھلی کھڑکی کے سامنے آ ٹھہرتے اور نصف گھنٹہ تک لمبے لمبے سانس لیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ تازہ ہوا کی ''آمد و رفت'' سے پھیپھڑے کشادہ ہوتے ہیں۔ موصوف یہ نہیں جانتے تھے کہ پھیپھڑوں سے زیادہ دل کی کشاد ضروری ہوتی ہے۔ ایک مدت تک ان کا یہی وطیرہ رہا' بعد ازاں وہ ہوا بھرنے والا پمپ خرید لائے اور اس کی نلی منہ میں ڈال کر آکسیجن کی فراہمی کا اہتمام فرماتے۔ یوں وہ صرف پانچ منٹوں میں پھیپھڑے کشادہ کر لیا کرتے۔ اس طریقہ کار سے بہر حال وقت کی بہت بچت ہوتی تھی۔ آکسیجن گیس کے گھونٹ پینے کے بعد بالاخر کپڑے تبدیل کر لیتے اور پھر فوراً ہی ورزش میں جت جاتے۔ آغا صاحب کے پاس ایک بوسیدہ سی رسی تھی جس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہ کسی تربیت یافتہ کتے کی طرح اچھل کود کیا کرتے۔ اگر وہ کوشش کرتے تو کسی سرکس کمپنی میں ایک ہونہار کتے کے فرائض انجام دے سکتے تھے۔ لیکن شاید یہ بات دیگر کتوں کی روزی مارنے کے مترادف ہوتی اس لیے وہ حاتم طائی کی قبر پر ''یک لتی'' مارتے ہوئے کتوں کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ہمارے خیال میں وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ آواز سگاں سے رزق میں کمی واقع ہو جاتی ہے ورنہ اس نفع بخش کاروبار میں ضرور ٹانگ اڑاتے۔

آغا صاحب دفتر میں بھی ورزش کا ''سلسلہ ہائے دور دراز'' جاری رکھتے اور سرکاری میز پر لیٹ کر حیرت ناک طور پر الٹی سیدھی قلابازیاں کھاتے۔ وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب وہ میز پر لیٹے لیٹے بائی سائیکل چلانے کے انداز میں ٹانگیں گھمایا کرتے۔ یہ

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

منظر دیکھ کر جانے کیوں ہمیں للو کمہار کا ''آنجہانی؟'' گدھا یاد آ جاتا جو بالکل اسی اسٹائل میں ریت میں ''غسل'' کیا کرتا تھا۔ غالباً گدھے کو بدن کے مسام کھولنے کی عادت تھی اور شاید وہ بھی اپنی حرکتوں کے باعث کیفر کردار کو پہنچا تھا۔

شام کے وقت بھی آغا صاحب کا ورزشی جنون ختم نہ ہوتا تھا اور وہ سورج غروب ہوتے ہی ویٹ لفٹنگ شروع کر دیتے۔ وہ اپنے وزن سے دگنے آہنی گولے حیرت انگیز طور پر اٹھا لیتے۔ اور اس فعل کے دوران میں اتنا شور مچاتے کہ آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ ایک کلومیٹر کے فاصلے سے یہ شور قیامت سن کر لوگ بوجھ لیا کرتے کہ آغا صاحب مصروف کار ہیں۔ رات کو سونے سے پیشتر بستر پر سر کے بل کھڑے ہو جاتے۔ یہ ورزش اس وقت تک جاری رہتی جب تک نیند کے باعث بستر پر دھڑام سے نہ گرتے۔ اکثر دھڑام کی آواز سے ان کی آنکھ کھل جاتی۔ اس موقع پر وہ سرہانے پر سر رکھ کر میر کا شعر گنگناتے ہوئے دوبارہ خواب خرگوش میں کھو جاتے۔ الٹا لٹکنے کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ اس طرح دماغ کی آلودگی دور ہو جاتی ہے۔ خیر اس ادا سے ان کے دماغ کی آلائشیں تو پاک نہ ہوئیں البتہ آلائشیں دماغ سے نجات پا گئیں۔

ایک روز صبح سویرے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ آغا صاحب جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ یہ خبر ہم پر بجلی بن کر گری۔ ان کی وفات کی مکمل تفصیلات سے یہ بات سامنے آئی کہ مرحوم حسب معمول شام کے وقت ویٹ لفٹنگ میں مگن تھے کہ ایک فولادی گولہ ان کے سر سے ٹکرایا اور یوں سر میں سودا رہا نہ تن میں جان۔۔۔۔۔۔ یہ ایک سبق آموز موت تھی۔ خصوصاً نئی نسل کے لئے ایک سانحہ میں عبرت کے کئی پہلو پوشیدہ ہیں۔ آج کل کے نوجوانوں پر بھی صحت مند ہونے کا بھوت سوار ہے۔ تندرستی و توانائی کی بقا کے لئے نوجوان علی الصبح بیدار ہو جاتے ہیں اور ٹریک سوٹ پہن کر سبزہ زاروں میں جا نکلتے ہیں۔ خبط صحت میں مبتلا یہ حضرات ننگے پاؤں' سبزہ بیگانہ پر سرپٹ دوڑتے ہیں' اور اپنے پاؤں کے تلوؤں کو شبنمی قطروں سے اس نیت سے بھگوتے ہیں کہ اس طرح آنکھوں کو طراوت ملتی ہے۔ یہ لوگ تمام سال نظام انہضام کی بے قاعدگیوں کا شکار رہتے ہیں اور خوراک ہضم کرنے والے خامروں کے متعلق فکر مند رہتے ہیں۔ عموماً ایسے لوگ ''سبزی خور'' نہیں ہوتے لیکن پھر بھی گوشت سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے مطابق گوشت میں لحمیات کی خطرناک حد تک فراوانی ہوتی ہے۔ ایسے احباب ٹونٹی کو کبھی منہ نہیں لگاتے بلکہ ڈیٹول سے دھلے ہوئے شیشے کے گلاس میں پانی نوش جاں کرتے ہیں۔ لیکن تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود انہیں کوئی معمولی نوعیت کی روایتی بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور وہ عام انسانوں کی طرح بلا چوں و چراں طویل عمری کا خواب آنکھوں میں لے خواب عدم کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

قارئین کرام! تندرستی کی نعمت اس طرح نہیں ملتی' صحت و سلامتی یوں حاصل نہیں ہوا کرتی۔ متذکرہ بالا تمام ہتھکنڈے اوچھے

ہیں۔ آپ اگر واقعی اس جہان آب و گل میں طویل قیام کا ارادہ رکھتے ہیں تو اپنے بے ڈھنگے معمولات ترک کر دیں اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں۔ اس نئی زندگی میں ہمارے مشورے ملحوظ خاطر رکھیں۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا اور مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔۔۔۔۔۔ دیکھئے' اگر آپ درازی عمر کے خواہاں ہیں تو صبح سویرے جاگنے کی حماقت ہرگز نہ کریں۔ اگر آپ کے دفتری اوقات کا آغاز دس بجے ہوتا ہے تو نو بجے سے قبل مت بیدار ہوں۔ اٹھنے کے فوراً بعد خالی پیٹ تھوڑی سی تازہ ہوا کھائیں۔ تازہ ہوا دستیاب ہو تو براہ کرم ہمیں بھی اس دکان کا پتہ بتلائیں۔ ہم تھوک کے حساب سے یہ جنس گراں مایہ خریدنا چاہیں گے۔ رہا' غسل کا معاملہ تو عرض ہے کہ سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے نہانا مردانگی کی علامت نہیں کیونکہ اکثر بیوقوف خواتین بھی ذاتی ضمانت پر یہ حرکت کر گزرتی ہیں۔ یخ بستہ پانی سے نہانے والے خواتین و حضرات اپنے غسل کے خود ذمہ دار ہوں گے۔۔۔۔۔۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔

اب ذرا جراثیموں سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ صاحبو! ان سے خوفزدہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ''سیاسی'' انداز میں ان کا مقابلہ کیا جائے۔ آپ کو اگر کہیں کوئی جرثومہ چہل قدمی کرتا ہوا نظر آئے تو بہ نفس نفیس چل کر اس کی خدمت میں حاضری دیں اور مودبانہ انداز میں مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھائیں۔ جیسے ہی وہ ہاتھ آگے کرے' فوراً اس کی بغل میں گدگدی کرنا شروع کر دیں۔ وہ جرثومہ قنوطی نہ ہوا تو لازمی طور پر مسکرائے گا۔ جونہی وہ قہقہہ لگانے کی غرض سے باچھیں کھولے فوراً جراثیم کش دوا اسکے منہ میں انڈیل دیں۔ لیجئے قصہ ختم ہوا۔ اگر آپ کے مدمقابل کوئی قنوطی جرثومہ ہوا تو اس کے سامنے کلام میر گنگنائیے۔ سنا ہے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔

اور اب بارے کچھ خوراک کے بیاں ہو جائے:

ناظرین! سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ غذا کے سلسلہ میں کسی پرہیز کی ضرورت نہیں۔ آپ ہر چیز کھائیں اور بے دریغ کھائیں۔ اس وقت تک کھاتے رہیں جب تک آپ مزید کھانے کے قابل نہیں رہتے۔ صرف اس امر کا خیال رہے کہ آپ کھانے کا بل ادا کرنے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اور سنئے' اس بات کی بالکل پرواہ نہ کریں کہ آپ کی خوراک میں نشاستہ' لحمیات یا وٹامن کی وافر مقدار ہے یا نہیں۔ یاد رکھیں' یہ عناصر جسم کو سڈول اور مضبوط ہرگز نہیں بناتے۔ آپ جسم کو سڈول اور ٹھوس بنانا چاہتے ہیں تو ہر صبح ناشتہ میں گوند کا ایک گلاس پیجئے۔ اس کے بعد سیمنٹ کا ایک چمچ کھا لیا کریں۔ یہ نسخہ کم و بیش ایک ماہ آزمائیں۔ ایک ماہ بعد آپ اپنے بدن میں پہلوانوں کی سی قوت و توانائی محسوس کریں گے۔ لیکن خدارا' پہلوانوں کی طرح ڈنڈ پیلنا شروع نہ کیجئے گا۔ آپ کو

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اگر ورزش کرنے کا بہت شوق ہے تو ہم روکنے والے کون ہوتے ہیں۔ بہر حال نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ ویسے ایک نادر مشورہ ہے اور وہ بھی مفت۔ اگر آپ مالی طور پر خوشحال ہیں تو پھر ورزش کی صعوبت برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کرائے پر چند کھلاڑی حاصل کریں' ان سے دوڑ لگوائیں' جمناسٹک کرائیں' کرکٹ کھلائیں اور خود کسی درخت کے سائے میں آرام سے بیٹھ کر سگریٹ کے کش لیں' اپنے کھلاڑیوں کا کھیل ملاحظہ کریں اور ''ہجر'' میں ''وصال'' کے مزے لیں۔

قارئین! آپ نے بہت توجہ اور ''ہمت مرداں'' سے ہماری تجاویز ملاحظہ کیں۔ اب ایک آخری مشورہ بھی سماعت فرمائیں اور وہ یہ کہ۔۔۔۔۔۔ ''مشورہ ضرور دیں' اور مفت دیں' لیکن مفت ہرگز نہ لیں۔''

◆◆◆

چند نئے خامہ خراب

اکثر نئے لکھنے والوں کو شکایت ہے کہ ہم ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے یعنی اپنے کالموں کو ان کے ذکر سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ ایک نوخیز لکھنے والے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خامہ بگوش کی دور کی نظر کمزور ہے' اس لئے وہ مستقبل کے بڑے ادیبوں کو پہچاننے سے معذور ہے۔ ہم اعتراف کرتے ہیں ہماری دور ہی کی نہیں' نزدیک کی نظر بھی خاصی کمزور ہے اسی لئے زمانہ حال کے اکثر ادیبوں کو پہچاننے میں کوتاہی ہو جاتی ہے اور اگر حسن اتفاق سے انہیں پہچان بھی لیتے ہیں تو نظر کی کوتاہی کہیں اور ظاہر ہو جاتی ہیں یعنی ان کے کمالات تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

یہ صحیح ہے کہ ہم نئے ادیبوں کو نہیں پڑھتے' اس کا سبب یہ ہے کہ پرانے ادیبوں نے ہمیں اتنا پریشان اور مایوس کیا ہے کہ اب ہم میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ نئے لکھنے والوں کو اپنی پریشانیوں اور مایوسیوں میں اضافے کا موقع دیں۔ لیکن دو نئے لکھنے والے بڑے موقع شناس نکلے' انہوں نے ایسے زمانے میں اپنی کتابیں بھیجیں جب ہمارے پڑھنے کے لئے کوئی کتاب نہیں تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ ان کتابوں کو پڑھ کر ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا' اگر یہ کتابیں لکھ کر خود مصنفین کا وقت ضائع ہوا ہو تو اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ ہر انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

پہلی کتاب محمد یعقوب غزنوی کی ہے اور اس کا نام ہے ''گستاخیاں''۔۔۔۔۔۔ دوسری کتاب ''گفتنی شگفتنی'' ہے جو وحید الرحمن خان کی تصنیف ہے۔ یعقوب غزنوی نے تو اپنی تصویر کے نیچے اپنا سال پیدائش لکھ دیا تھا مگر اس عزیز نے اسے صیغہ راز میں رکھا ہے' تاہم تصویر نے راز کو راز نہیں رہنے دیا کیونکہ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مصنف اور کتاب کے منصہ شہود پر آنے کے درمیان کچھ زیادہ وقفہ نہیں ہے۔ اس کی تصدیق عطاء الحق قاسمی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ ''وحید الرحمن اس وقت کے جس حصے سے گزر رہا ہے' وہ ڈکیتی اور رہزنی کے لئے موزوں ہے' ان مشاغل کا استحقاق اسے یوں بھی حاصل ہے کہ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور یونیورسٹی کا طالب علم بھی ہے۔''

عزیز موصوف نے اپنا مشغلہ تو وہی رکھا ہے جس کی طرف عطاء الحق قاسمی نے اشارہ کیا ہے' لیکن حصول مقصد کے لئے کلاشنکوف کی بجائے قلم سے کام لیا ہے۔ کلاشنکوف اور قلم دونوں کے چلانے کے لئے کسی خاص استعداد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اناڑی سے

www.urdukutabkhanapk.blogspot.com

اناڑی آدمی ان دونوں کو با آسانی چلا سکتا ہے اور اگر چلانے والا باصلاحیت ہو تو بہتر نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وحید الرحمن خان نے قلم چلانے میں خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے اس لئے اس پر ''اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند'' کی پھبتی نہیں کسی جا سکتی۔ اس کے ہاں طنز کے مقابلے میں مزاح کا پلہ بھاری ہے۔ وہ ماشاء اللہ شاعر بھی ہے۔ اس نے کتاب کے شروع میں ''عذر مزاح'' کے عنوان سے اس طرح معذرت پیش کی ہے یا اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے:

ان دنوں مجھ پر ظرافت کا جنوں طاری ہے
سر پہ خوش نامی و شہرت کا جنوں طاری ہے
ماہ پاروں سے شرارت کا جنوں طاری ہے
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری ہے

چوتھا مصرع تو بھرتی کا ہے لیکن پہلے تین مصرعے حسب حال ہیں اور ان کی تصدیق کتاب کے مطالعہ سے بھی ہوتی ہے۔ ظرافت کا جنوں طاری ہوتا تو کتاب لکھی ہی نہ جا سکتی تھی۔ خوش نامی و شہرت کا شوق نہ ہوتا تو کتاب کے چھپنے کی نوبت نہ آتی' ماہ پاروں سے شرارت عمر کا تقاضا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی تقاضے کو نبھانے ہی میں انہوں نے اب تک کی عمر بسر کی ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون ہی عشق و عاشقی سے متعلق ہے۔ ایک مضمون ''ظرافت نامے'' میں بھی ''سرکار حسن و شباب'' سے مراسلت ملتی ہے۔ لیکن کتاب میں یہی کچھ نہیں اور بہت کچھ بھی ہے مثلاً روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انہوں نے دلکش مزاح پارے تخلیق کئے ہیں جیسے دروازے کی گھنٹی جو اکثر فقیروں اور ناخواندہ مہمانوں کے استعمال میں رہتی ہے یا ریل کا سفر جس میں منزل مقصود منزل آخر بنتی نظر آتی ہے۔

وحید الرحمن خان بنیادی طور پر قصہ گو ہے وہ کسی بھی موضوع پر لکھے کوئی نہ کوئی قصہ اس کے ذہن میں ضرور ہوتا ہے۔ اس قصے کے کردار اپنی حرکات اور گفتگو سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یہ مزاح عموماً لفظوں کے توڑ جوڑ سے پیدا ہوتا ہے اس توڑ جوڑ کی بہتر مثال ''خامہ خراب'' کی ترکیب ہے جو اس نے اپنے لئے استعمال کی ہے' مگر یہ ترکیب کتاب میں نہیں ہے۔ اس نے ہمارے نام خط میں لکھی ہے جو کتاب کے ساتھ موصول ہوا ہے یہ ترکیب ہمیں اتنی اچھی لگی کہ اسے اپنے کالم کا عنوان بنا لیا۔ ہماری دعا ہے کہ وحید الرحمن خان کی خامہ خرابی شہرت کے جنوں تک محدود نہ رہے اور وہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد بلاغت کے رازوں تک بھی پہنچے۔

(خامہ بگوش کے قلم سے)

◆◆◆

اُردو کُتب خانہ پی کے
urdukutabkhanapk.blogspot
urdukutabkhanapk.blogspot.com